عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

زیرِ ادارت سید نذیر نیازی

KARACHI 719

خاص عنوانات

حضرت علامہ اقبال مدظلہ کی تازہ نظم مدنیت اسلام

ختم نبوت از مولانا اسلم — اردو ادب کی اسلامی تحریک

سیاست معاشی از ڈاکٹر ذاکر حسین

دو مسافر (افسانہ) احمد بیے — انگریز کیا ھیں؟ ھیرلڈ نکلسن

علامہ اقبال اور ختم نبوت

قضیہ شہید گنج، مصر و حبش، جاپان کا بڑھتا ہوا تغلب

سر شاہ سلیمان کا نظریۂ اضافیت

محمد علی اور امیر سعود

اکتوبر ۱۹۳۵

طلوع اسلام

ایک ماہوار رسالہ مشتمل بر حیات ملیہ اسلامیہ

اکتوبر ۱۹۳۵ء — مجلد اول۔ شمارہ ۱

۴۱۹

فہرست مضامین

شذرات ۳

مدنیت اسلام (نظم) حضرت علامہ اقبال مدظلہ العالی ۱۱

مقالات

ملت اسلامیہ ہند ... سید نذیر نیازی ۱۲

ختم نبوت ... مولنا اسلم جیراجپوری ۱۶

سیاست معاشی ... ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ۲۴

اردو ادب کی اسلامی تحریک .. سید نصیر احمد ۳۲

مسائل حاضرہ — قضیہ شہید گنج ... مدیر ۴۱

آثار ملیہ — مسجد شاہ چراغ ... مدیر ۴۴

تاریخ و سیاسیات عالم

بین الاقوامی دنیا ... ۴۷
حبشی اطالوی نزاع — جاپان کا بڑھتا ہوا تغلب

سیاسیات ہند ... ۵۳
اسمبلی کا اجلاس شملہ — کانگریس کی ذمہ داریاں — سیاسیات پنجاب

بلاد اسلامیہ ... ۶۰
سیاسیات ترکی — مشرقی ترکستان — مصر و حبش

رجال و مشاہیر — محمد علی — امیر سعود

آثار و مقامات — مزار نورجہاں بیگم

جہان گوراں — دو مسافر (افسانہ) — احمد بے — انگریز کیا ہیں؟ — ہیرلڈ نکلسن ۷۰

ہمارے معاصرین — ہندوستانی تہذیب اور اسلام — ترکوں کا جنون مغربیت — لارنس — برازیل — مسیحی تبلیغ ۷۹

تنقید کتب — شاہنامہ اسلام — خطبات خالدہ ادیب خانم ۸۷

مراسلات — لائٹ کا عجز فہم ... راجہ حسن اختر بی۔ اے پی سی ایس ۹۴

بزم طلوع اسلام

علامہ اقبال اور ختم نبوت — سید نذیر نیازی ۹۹ — سر شاہ سلیمان کا نظریہ اضافیت — تلخیص ۱۰۹

تہدیہ

اس غیر معمولی شفقت اور ہمت افزائی کے لئے جس سے مجھے طلوع اسلام کی اشاعت کا حوصلہ ہوا میں اپنی اس ناچیز کوشش کو حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہ کی خدمت بابرکت میں پیش کرتا ہوں اس امید میں کہ حضرت ممدوح ازرہ نوازش اسے شرف قبولیت بخشینگے۔

ہمی شرم دارم کہ پائے ملخ را
سوئے بارگاہ سلیماں فرستم
ہمی ترسم از ریش خندِ ریاحیں
کہ خارِ مغیلاں بہ بستاں فرستم

ارادت کیش

نیازی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

۹۱۹

شذرات

یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ طلوع اسلام کی اشاعت کا جو تصور ہم نے قائم رکھا تھا احباب نے اس کا خیر مقدم دلی شوق اور گرمجوشی سے کیا اور اگر آج ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ ہماری یہ دیرینہ آرزو بالآخر پوری ہوئی تو صرف ان کے ایثار اور التفات و توجہ کی بدولت انھوں نے جس محبت اور ہمدردی کے ساتھ طلوع اسلام کی کامیابی کو اپنی کامیابی سمجھتے ہوئے ہر ممکن طریق پر دست اعانت بڑھایا اس کا ہمارے دل پر خاص اثر ہے۔ ادب مانع ہے کہ یہاں ہم ان شفقت آمیز الفاظ کا ذکر کریں جو بزرگوں نے ہمارے حق میں استعمال کیئے اور جنھوں نے اُمید سے بڑھکر ہماری جرأت و ہمت میں اضافہ کیا۔ ہمارے بعض کرم فرماؤں کا بیشک یہ خیال تھا کہ ملک کی موجودہ فضا کسی مفید علمی یا ادبی کاوش کے لئے موزوں نہیں اور ہو بھی تو ہر شخص اس کا اہل نہیں کہ صحافت کے خارزار میں قدم رکھے لیکن ہم نے ان کی رائے سے اختلاف کیا کیونکہ طلوع اسلام کے مقاصد اور اُس کی روش و ترتیب کے متعلق ہم ایک مخصوص طرز عمل اور مستقل نظریہ رکھتے ہیں۔ بایں ہمہ اس سے ہمارے اس جذبۂ تشکر میں کوئی فرق نہیں آتا جو قدر دانان طلوع اسلام کی مخلصانہ کوششوں کے لئے ہمارے دل میں موجزن ہے اور اگر اس وقت ہم ان کا تذکرہ الفاظ میں نہیں کر رہے تو محض اس لئے کہ دوستوں کی مروت اور ان کے خلوص نیت کا اشتہار نہ ہمیں پسند ہے نہ ان کو۔ البتہ سید سلامت اللہ صاحب کا شکریہ بہر حال ہم پر واجب ہے اس لئے کہ اگر ان کی توجہ شامل حال نہ ہوتی تو ابھی شاید بہت دنوں تک اس

ارادے کی تکمیل نہ ہوسکی ہمیں یقین ہے کہ اگر یہ سطور شاہ صاحب کی نظر سے گذریں۔ تو وہ ان کو تکلف یا ظاہر داری پر محمول نہیں کرینگے بلکہ اس امر کا خیال رکھیں گے کہ طلوع اسلام کی اشاعت میں اگر لفظاً نہیں تو معناً ان کا اشتراک شروع ہی سے قائم ہے۔

آداب صحافت کا تقاضا تھا کہ طلوع اسلام کی اشاعت میں جو مقصد ہمارے پیش نظر ہے یا اس کی ترتیب کے متعلق جو تجاویز ہم اپنے ذہن میں رکھتے ہیں ان کی حتی الوسع تشریح کیجاتی۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ مسئلہ کچھ ایسا اہم نہیں جس میں قارئین کا وقت ضائع کیا جائے۔ اس لئے طلوع اسلام کی آئندہ اشاعتوں میں یہ تمام امور خود بخود ان کے سامنے آجائیں گے۔ بہتر یہ ہوگا کہ اس وقت ہم ان کی توجہ بعض ایسے مسائل کی طرف منعطف کرائیں جو حال ہی میں چند افسوسناک واقعات سے مترتب ہوئے اور جن کو ملت کی آئندہ زندگی میں یقیناً غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگی۔

کچھ دنوں سے ہندوستان کی جماعتی فضا مسلمانوں کے لئے خاص طور سے مکدر ہو چلی ہے غلامی بجائے خود ایک لعنت ہے اور اگر اس لعنت میں اغیار کی چیرہ دستیوں سے بڑھکر ہمیں اپنی ہی بے راہ روی کی شکایت کرنا پڑے تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ کس قدر خوفناک ہوگا۔ مسجد شہید گنج کا انہدام ایک ایسا جگر خراش سانحہ ہے جس کو مسلمان مدت دراز تک فراموش نہیں کر سکینگے۔ رنج یہ ہے کہ اسلامیان ہند کی دینی اور سیاسی عصبیت کا یہ نشان خود ان کی بے حمیتی سے مٹ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم نے اس المناک حادثے کی موجودہ صورت حالات سے آگے چلکر بحث کی ہے۔ سردست ہمیں اس سلسلے میں دو باتوں کی طرف اشارا کرنا ہے۔

آج سے چند ماہ پیشتر جب علامہ اقبال مدظلہ نے تحریک قادیان کے متعلق اپنا معرکۃ الآرا بیان شائع کیا ہے۔ تو اس میں ایک لطیف نکتہ یہ بھی تھا کہ ملی اعتبار سے مسلمانان ہند کا وجود اتنا بھی مستحکم نہیں جتنا یہود کا اہل روما کے ماتحت۔ یہودی مجلس اپنے اندرونی معاملات کے متعلق جو فیصلہ کرتی تھی رومی حکام پر اس کا احترام لازم

تھا اور وہ بروئے آئین مجبور تھے کہ ان مواقع پر حکومت کا قانون مجلس کا ساتھ دے۔ کسی ملت کے استحکام کے لئے یہ امر جس قدر ضروری ہے اس کی تشریح محتاج بیان نہیں مگر افسوس یہ ہے کہ اپنے زمانہ حکومت میں دوسری اقوام کو اس قسم کی حفاظت عطا کرنے کے باوجود آج مسلمان خود اس سے محروم ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ذمہ داری ایک حد تک ہماری تاریخ پر بھی عائد ہوتی ہے۔ یعنی اسلامی حکومت کے اس طرز عمل پر جو مغلوں کے عہد عروج سے بالخصوص شروع ہوتا ہے۔ بہر کیف علامہ ممدوح کا یہ خیال کس قدر صحیح تھا اس کی تائید خود واقعات نے کر دی۔ جو لوگ اس وقت ان کے اس ارشاد کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھے ان کو چاہیئے کہ اب مسجد شہید گنج کے افسوسناک انہدام پر ایک دفعہ پھر غور کریں۔ ہم ہندوستان کے مستقبل سے مایوس نہیں یقین ہے کہ اتحاد و یک جہتی کا احساس اور ہمارا اعلیٰ تدبر اس ملک کے مختلف عناصر میں ایک نہ ایک دن ضرور کوئی مفاہمت پیدا کر دے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس مقصد کیلئے جو ذرائع اس وقت اختیار کئے جا رہے ہیں کہاں تک موزوں ہیں۔ یہاں اُن حضرات سے بحث نہیں جو اس گمان فاسد میں مبتلا ہیں کہ دین و ملت کا تفرقہ ایک عارضی شئے ہے جس کو دور حاضر کے سیاسی اور معاشی عوامل رفتہ رفتہ ختم کر دینگے یہ لوگ اسلام کے اخلاقی اور تمدنی امکانات سے ناواقف ہیں اور اس بات میں فرق نہیں کر سکتے کہ اسلام کی غیر معمولی اور رلانہ دل قوت اور مسلمانوں کا انحطاط دو الگ اور مختلف چیزیں ہیں۔ اندریں حالات ہماری دشواریوں کا حل کیا ہے؟ یہی کہ ہندوستان کی سیاسی اور معاشی جد وجہد میں حصہ لینے کے باوجود — جو اس ملک میں اسلامی تعلیمات کی عملی ترجمانی کے لئے بجائے خود ناگزیر ہے — ہم استحکام ملت پر نظر رکھیں تاکہ بحیثیت ایک قوم کے ہمارا نشو ونما قرآن و سنت کا پابند رہے۔ اس وقت ہمارے سیاسی اور اجتماعی ماحول کی جو کیفیت ہے وہ کسی طرح بھی اطمینان کے قابل نہیں۔ آئینی اعتبار سے یعنی جہاں تک ہندوستان کے آئندہ دستور کا تعلق ہے۔ ہمارا وجود ملی "تحفظات" کا مرہون منت ہوگا اور اقوام ہند کی باہمی مفاہمت کے ضمن میں کانگریس کہ اس کو سب سے بڑھکر ہندوستان کی نمائندگی کا دعویٰ ہے اس کے نئے کلچرل آٹانومی — آزادیٔ تمدن — کی دلفریب لیکن خالی از معنیٰ اصطلاح وضع کی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ تحفظات جن کا نتیجہ مجالس وضع قوانین میں دو ایک نشستوں کے اضافے یا طریق انتخاب اور رلانہ متوں

ہیں جزوی رعایات کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا استحکام ملت میں کہاں تک مساعد ہو سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا آزادی تمدن' کا اصول بھی سراسر غلط اور گمراہ کن ہے۔ ہندوستان کی سیاست وطنی کی بنا جدید عمرانی تصورات — نیشنلزم (خواہ اس کی تعبیر میں کتنی ہی گنجائشیں رکھی جائیں) — پر ہے اور یہ عمرانی تصورات اسلام کے اجتماعی نصب العین سے یک قلم بیگانہ۔ لہذا اسلامی تعلیمات اور تحفظ ذات دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنے گرد و پیش کے سیاسی عوامل اور اجتماعی تغیرات کا بغور جائزہ لیتے رہیں اور اپنے لئے جو مسلک بھی اختیار کریں اس میں ان کی نظر ملت کی شیرازہ بندی اور اس کے مخصوص مقاصد پر رہے۔ ہمارے لئے کفر اور اسلام کا جو امتیاز اللہ تعالےٰ نے پیدا کر دیا ہے اس کا قائم رکھنا ضروری ہے — یہاں تک کہ تمام دنیا اسلام کے آغوش میں آجائے یہ سیاست اسلامی کی اساس ہے باقی تمام مسائل بعد میں پیدا ہوتے ہیں اس لئے کہ قوموں کا تمدن انکی سیاست سے الگ نہیں ہوا کرتا۔ سیاست اس قوت کا مظہر ہے جو مصالح تمدن کی حفاظت کرتی ہے۔

لیکن یہ مقصد صحیح قیادت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اور مسلمانوں کی قیادت اس وقت بجائے خود ایک معمہ ہے ذاتی طور سے ہم ملت کے موجودہ انتشار اور بے اتفاقی سے مایوس نہیں اس لئے کہ اس کے اندر اتحاد و اصلاح کے عناصر موجود ہیں۔ بایں ہمہ ہماری بہبودی اسی میں ہے کہ یہ صورت حالات فوراً ختم ہو جائے۔ ہم نے ابھی عرض کیا تھا کہ ہندوستان کی آئینی تبدیلیاں ہوں یا سیاست وطنی کا ہنگامہ مسلمان دونوں کے زیر اثر مغربی خیالات کی زد میں آ رہے ہیں اصلاحات کا تقاضا ہے کہ ہم سیاست و مدنیت کے جدید ادارات کو اختیار کریں بعینہٖ جس طرح ملکی تحریکات کا دارومدار باوجود ایک سودیشی قالب کے یورپ ہی کی تقلید پر ہے۔ لہذا عملاً اور ذہناً مسلمان جس خطرے میں گرفتار ہیں اس کا علاج فقط یہ ہے کہ ہم اپنے شعور ملی کی حفاظت کریں جو اس وقت بدقسمتی سے مفقود ہے۔ لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم ان سیاسی اور معاشی عوامل کے مخالف ہیں۔ جن کے ماتحت دنیا کا اجتماعی نظام بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ صحت احساس کے باوجود ان کی اساس چند غلط تصورات پر قائم ہے۔ لہذا ہندوستان کے مسلمان رہنما جو کچھ زمانے کے اثرات اور کچھ بلاد اسلامیہ کی تقلید

کے دھوکے میں نادانستہ اس طوفان میں بہ رہے ہیں انکی کوششیں اخلاص اور بے نفسی کے باوجود کوئی خوشگوار نتائج پیدا نہیں کر سکیں۔ اسلام کی روح قرآن وسنت کی روح ہے اور جب تک یہ روح ہماری سیاسیات میں سرایت نہیں کرتی ملت اور ملت کے رہنماؤں کا تصادم باقی رہے گا۔ تاریخ عالم کا یہ ایک عجیب وغریب منظر ہے کہ دنیا کا کوئی فتنہ اسلام کی صحیح اور سچی روح کو مغلوب نہیں کر سکا۔ یہ اس کی اندرونی قوت اس کے دین فطرت اور "محفوظ و برقرار" رہنے کا ایک ناقابل انکار ثبوت ہے۔ لہٰذا ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کو اپنی موجودہ روش پر غور کرنا چاہیے کہ اس میں کہیں اصلاح و ترمیم کی تو گنجائش نہیں۔ لوگ کہتے ہیں مسلمانوں میں اہل غرض کی کثرت ہے۔ ہم سمجھتے ہیں یہ الزام کلیۃً صحیح نہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہندوستان کی سیاسی فضا بہت زیادہ پیچیدہ اور مختلف الحال ہے اور اس میں موثر قیادت کے امکانات نہایت کم یہ بھی صحیح ہے کہ ایک غلط مذہبیت 'انفرادیت پسند دینی زندگی اور ہیئت ملی کے چند مسخ شدہ ادارات نے جماعت کے اندر ربط و انضباط کا کوئی موقعہ نہیں چھوڑا تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ مغربی خیالات سے مرعوب ہے اور ان کا بڑا حصہ محض عملی ضروریات سے مجبور ہو کر مسلمان رہ گیا ہے۔ وہ اپنے ارتداد ذہنی کو تحقیق' جستجو' وسعت' رواداری' آزادی' انسان دوستی' فن (آرٹ) علم اور معلوم نہیں کن کن چیزوں کا نام لیکر چھپاتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہی لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے مستقبل سے مایوس ہو جائیں۔ پچھلے پچاس برس سے اسلام اس ملک میں ان زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہے جنھوں نے اس کی بلند و برتر روح کو جکڑ رکھا ہے۔ کیا ہماری سیاسی جدوجہد سے اس حقیقت کا انکشاف نہیں ہوتا کہ ہماری ناکامیاں اور ہمارا اضطراب اسلام کے غیر فانی امکانات سے انحراف کی دلیل ہے۔ پھر کیا ہمارا فرض نہیں کہ ہم اسلام کی روشنی میں اپنے اجتماعی مقاصد کا تصور کریں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن ایسی شمع ہدایت اور اسوۂ حسنہ حضور رسالتمآب صلعم کے ہوتے ہوئے اس مقصد کا تصور کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس وقت ملت میں رہنماؤں کی کمی نہیں۔ ان میں بفضلہ تعالےٰ جوش عمل بھی ہے اور متانت فکر بھی اور ما نہیں اس امر کا احساس بھی ہوگا کہ اسلام میں قیادت ایک ملی فریضہ ہے ایک امانت جس کے لیے وہ خود اپنی ضمیر اور اپنی ذات کے مقدس ترین ارادوں کے سامنے جواب دہ ہیں۔ جن لوگوں کے احساس ذمہ داری کا یہ عالم ہو وہ کیونکر گوارا کر سکتے

ہیں کہ ان کا قدم جادۂ شریعت سے ایک انچ بھی اِدھراُدھر ہونے پائے۔ وہ قوم کے امین ہونگے اور قوم انہیں اعتماد کی نظر سے دیکھے گی ان کی سیرت اور ان کا اخلاق دوسروں کے لئے نمونے کا کام دے گا۔ یہی لوگ حقیقتاً سفینۂ ملت کے ناخدا ہیں ـــــ کیا آٹھ کروڑ مسلمانوں میں قیادت و رہنمائی کا یہ جذبہ فی الواقعہ ناپید ہے؟

اس سلسلے میں ہم یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہندوستان کی آئندہ اصلاحات کے متعلق ہماری ایک جماعت نے جو روش اختیار کر رکھی ہے وہ نہایت ہی عجیب و غریب ہے۔ ایک زمانے میں مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا تھا کہ ان کی تمامتر توجہ حصول آزادی پر ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ آزادی ہی وہ اسم اعظم ہے جس کی برکت سے ان کی تمام مشکلات دور ہوجائینگی۔ ان کی آزادی دنیائے اسلام کی آزادی کا پیش خیمہ ہوگی۔ خلافت اسلامیہ کی تجدید و استحکام کا دیباچہ اور مسلمانان عالم کے احیا و ارتقا کی تمہید۔ بیشک آزادی بڑی نعمت ہے اس لئے کہ یہ عبارت ہے اس قوت سے جس کے ماتحت قومیں اپنے ماحول کو جس طرح چاہیں بدل سکتی ہیں لیکن محض اس قوت کی تمنا کافی نہیں۔ اس کے ساتھ مستقبل کا ایک صحیح اور واضح تصور شرط ہے۔ یہ اسی تصور کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ ہمارے علمبرداران حریت نے ایک ایسی راہ اختیار کر رکھی ہے جو قوم کے حقیقی مفاد کے لئے کسی طرح بھی موزوں نہیں بلکہ اگر اس وقت الحاد اور بے دینی کی ایک عام رو نوجوانوں میں دوڑ گئی ہے تو اس کی ذمہ داری بھی ایک حد تک انہیں پر عائد ہوتی ہے۔ ان حضرات نے یہ خیال نہیں کیا کہ محض ایک سیاسی اقدام سے وہ نفسیاتی کیفیت کیونکر مترتب ہوسکتی ہے جو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا موجب ہو۔ اسلام کے تجدید و احیا کے لئے اسلامی تربیت اور اسلامی روح ناگزیر ہے۔ قرآن مجید نے بھی تو استخلاف فی الارض کا وعدہ اسی حالت میں کیا ہے جب ایمان کے ساتھ اعمال صالح موجود ہوں۔ یہ تصویر کا ایک رُخ تھا۔ اب اس کا دوسرا پہلو ملاحظہ ہو۔ قانون حکومت ہند کے ماتحت جن اصلاحات کی ابتدا عنقریب ہونیوالی ہے ان کا ضروری تقاضا ہے کہ مسلمان ان کے متعلق کوئی صحیح طرز عمل اختیار کرلیں ـــ رد و قبول، مزاحمت یا جزوی تعاون ـــ لیکن بعض دردمندان قوم کا یہ ارشاد ہے کہ ہماری توجہ اصلاحات اور صرف اصلاحات پر ہونی چاہئے۔ قوم کے استحکام، اس کی اصلاح و تربیت یا دوسری ضروریات کے لئے کسی تعمیری یا تخریبی کوشش کی ضرورت

نہیں۔کیونکہ اصلاحات کا نفاذ قریب ہے۔گویا اصلاحات کیا ہیں مسلمانوں کے لئے صحیح عیش کی تمہید کہ ان کا آغاز ایک دورِ مسرت اور کامرانی کا آغاز ہے جس سے ملت کی تمام نحوستیں اور اس کا ادبار یک قلم ختم ہوجائیگا۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم اصلاحات سے فائدہ اُٹھانے کے مخالف ہیں۔طلوع اسلام ایک علمی پرچہ ہے اور اس کو عملی سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں بجز اس کے کہ وہ اصولی اعتبار سے ان کا جائزہ لیتا رہے ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ اگر ہم اپنی ملی ضروریات سے بے خبر رہے تو اصلاحات سے بھی کما حقہٗ استفادہ ناممکن ہے۔اسی لئے ہم نے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں کے لئے دو چیزیں ازبس کہ ضروری ہیں۔۔۔۔ استحکام ملت اور صحیح قیادت۔

اکتوبر کے آخری ہفتے میں خواجہ حالی مرحوم کا صد سالہ یوم ولادت پانی پت میں منایا جائیگا۔یہ خبر جس قدر مسرت خیز تھی اس کی اہمیت میں اس اطلاع سے اور بھی اضافہ ہوگیا ہے کہ اس تقریب کی صدارت اعلحضرت تاجدار بھوپال خلد اللہ ملکہٗ نے قبول فرمائی ہے ہم اراکین حالی مسلم اسکول کو ان کے حسن انتخاب پر مبارک باد دیتے ہیں۔فرماں روایان بھوپال کی علمی قدردانیوں کا تذکرہ محتاج بیان نہیں۔اسلامی ہند کا گوشہ گوشہ ان کی سخاوت اور فیاضی کا ممنون احسان ہے۔ہمیں یقین ہے کہ ہز ہائنس کی تشریف آوری سے اس موقع کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی۔یہ گویا ایک طرح کا اظہار عقیدت ہوگا ایک تاجدار کی طرف سے دوسرے تاجدار کے حضور میں۔بیشک حالی شعر و سخن کا بادشاہ تھا۔ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے ادب اردو کے حامی جو کچھ بھی کریں کم ہے لیکن حالی کا تھوڑا سا حق ملت اسلامیہ پر بھی ہے۔وہ ہندوستان میں اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے نقیب ہیں۔ان کے دل میں ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ اس ملک کے مسلمان ایک دفعہ پھر ایک آزاد اور متمیز و منفرد قوم کا درجہ حاصل کریں۔اکابرین قوم سے اُمید ہے کہ وہ اس نہایت ہی مبارک اور مفید اجتماع میں شریک ہوکر حالی کی یاد کو زندہ رکھنے کی کوشش کرینگے۔اس لئے کہ ان کے پیام کی آج بھی ملت کو ویسی ہی ضرورت ہے جیسے تیس یا چالیس برس پہلے تھی۔

علامہ سید رشید رضا صاحب المنار کی وفات سے اسلامی علم وفضل کو جو زبردست نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی مدت تک نہیں ہو سکے گی۔ دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں اس خبر کو دلی رنج اور افسوس کے ساتھ سنا گیا۔ سید صاحب کا جوش دینی ان کی ملی اور اسلامی غیرت اور مذہبی تعلیمات کے نشر واشاعت میں انکی مسلسل کوششیں محتاج تعارف نہیں۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم، بہت بڑے مفسر، فقیہ محدث، متکلم غرضیکہ وہ سب کچھ تھے جو ایک بلند خیال عالم وفاضل اور حساس مسلمان ہو سکتا ہے سیاسیات اسلامی سے ان کا تعلق ہمیشہ قائم رہا۔ وہ ان عالی ہمت اور روشن خیال علما کا نہایت درخشندہ اور قابل تقلید نمونہ تھے جن کی تربیت سید جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہٗ کے فیض صحبت میں ہوئی سید صاحب مرحوم مغفور ہندوستان بھی تشریف لا چکے ہیں۔ ۱۹۱۱ء میں ندوۃ العلما کے سالانہ اجلاس کی صدارت انہیں نے فرمائی تھی۔ اس نسبت سے ہمارے لئے یہ خبر اور بھی زیادہ رنج وافسوس کا باعث ہے۔ طلوع اسلام کی کسی آئندہ اشاعت میں ہم انشاء العزیز اسلامی دنیا کے اس فاضل اجل کے حالات زندگی پر کسیقدر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالینگے۔

نقشوں اور کارٹونوں کی طیاری کے لئے ہمیں اپنے عزیز سید محمود بہاری متعلم جامعہ کا شکریہ ادا کرنا ہے۔

البتہ رسالے کی موجودہ ضخامت اُس کی ترتیب واشاعت اور طباعت کے متعلق بعض ضروری معروضات سرورق کے دوسرے صفحے پر مذکور ہیں۔ امید ہے قارئین کرام ان کا مطالعہ فرما کر ہمیں اپنی رائے سے مطلع کرینگے۔

مدنیت اسلام

حضرت علامہ اقبال مدظلہٗ کی ایک تازہ نظم

ہم انتہائی فخر و مسرت کے ساتھ حضرت علامہ اقبال مدظلہٗ کی یہ نظم شائع کر رہے ہیں جو انھوں نے خاص طور سے طلوع اسلام کے لئے مرحمت فرمائی۔ ہمیں یقین ہے کہ آئندہ بھی طلوع اسلام کو یہ شرف حاصل ہوتا رہے گا کہ اُس کی وساطت سے حضرت علامہ کے ارشادات ملت تک پہنچتے رہیں۔ انشاءاللہ

مدیر طلوع اسلام

بتاؤں تجھکو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں

طلوع ہے صفتِ آفتاب اس کا غروب
یگانہ اور مثیل زمانہ گوناگوں

حقائقِ ابدی پر مدار ہے اس کا
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسن طبیعت۔ عرب کا سوزِ دروں

ملت اسلامیہ ہند

سید نذیر نیازی

اس وقت ہندوستان کے سیاسی نشوونما اور اس کے مستقبل کا جو مسئلہ درپیش ہے اس کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ اہل ہند اپنے باہمی روابط میں ایک دوسرے کے متعلق کیا طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ ہندوستان ایک ملک ہے اور نہیں بھی۔ معاشی اور سیاسی مصالح کی طرح اس کا تاریخی اشتراک مسلم ہے لیکن اس میں ایک پہلو اختلاف اور بیگانگی کا بھی ہے۔ ہمارا مطلب ہے نسل، قوم اور زبان کے اس فرق سے جو اس ملک کے طبعی خصائص کے ساتھ بتدریج وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ جغرافی حالات کا یہ تنوع کچھ بہت زیادہ اہم نہ تھا اگر اس میں تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاشرت کی وہ متضاد قوتیں حائل نہ ہوتیں جن کا تعلق اسلام اور ہندو مذہب ــــ دوسرے ادیان کے علاوہ ــــ کے تصور حیات سے ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندوستانیوں میں کبھی ایک قوم بننے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی۔ ایسی قوم جو اپنے سیاسی اور معاشی اشتراک کے ساتھ عملی اور ذہنی اتحاد و یگانگت کا دعویٰ رکھتی ہو۔ فرمانروایان ہند کی البتہ ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اس عظیم الشان سرزمین میں ایک ہی حکومت قائم ہو سکے لیکن جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہے انقطاع ہند کا غیر معمولی بعد اور اس کے باشندوں کا تمدنی تفاوت ہمیشہ اس مقصد میں حارج رہا۔ قیاس یہ ہے کہ اگر مسلمانان عالم کے سیاسی زوال اور جدید علمی اختراعات کے ساتھ ہندوستان کے مغل اور افغان بادشاہوں کی کوششیں انگریزوں کی مساعدت نہ کرتیں تو ان کے لیے بھی اس نیم براعظم میں ایک ہی سلطنت قائم کرنا مشکل ہو جاتا۔

لیکن انگریزی حکومت نے صرف یہی نہیں کیا کہ اس ملک کے مختلف الجنس عناصر اور اس کے طویل و عریض رقبوں کے اردگرد ایک سیاسی خط کھینچ دیا ہے۔ اس نے جدید ادارات کی ترویج اور مغربی افکار کی اشاعت سے ہمارے سامنے مشترک طور پر یہ مسئلہ بھی پیش کر دیا کہ ہندوستان کے باشندے اپنے مخصوص ارتقائی آرزو اور ملی روایات کے تحفظ، اتحاد و مصالحت اور باہمی تعاون کی بنا کس اصول پر رکھیں۔ اس کا ایک بظاہر آسان اور یورپ کے جدید وطنی تصورات کے زیر اثر نہایت دلکش ذریعہ "مشترکہ قومیت" کی پرورش ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ مذہب کا تعلق جماعت کی بجائے

صرف افراد سے رہ جائے اور وہ بھی روحانی معاملات میں یکسوئی اصول کار ہو یا الحاد و بیدینی اور مادیت پرستی کی وہ تحریک جس کا بعض تعلیم یافتہ نوجوانوں میں آجکل خاص زور ہے یہاں تشکک و متذبذب لہذا بزدل (اور دنیا پسند) طبائع کا ذکر نہیں جن کا وجود غالباً ہمیشہ رہیگا۔ دونوں کی ناکامیابی یقینی ہے، روحانی اور غیر روحانی معاملات کا امتیاز ایک بے حقیقت اور احمقانہ خیال ہے اور زندگی کی تعمیر بغیر کسی اساس کے ناممکن۔ گویا اس ملک میں دین کی مخالفت یا اس کی "ہندوانہ" تعبیر کا راز صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان میں قومیت اور وطنیت کے نام پر ہندو تہذیب و تمدن کو فروغ دیا جاتا یہ صحیح ہے کہ حامیان اشتراکیت۔ اگر وہ فی الواقعہ کہیں موجود ہیں۔ اس گروہ میں شامل نہیں مگر وہ اپنے غیر مکمل۔ بظاہر قطعی۔ عقائد کے باوجود یہ نہیں سمجھتے کہ اسلام اپنے اندر اشتراکیت کو بھی جذب کر سکتا ہے۔ البتہ مسلمانوں کو سیاسی ہنگاموں کی اس پیداوار سے ضرور خطرہ ہے جس کے شوق مفاہمت اور غالباً صدق نیت۔ سے اس وقت چند سطحی اور نہایت درجہ متضاد و متناقض خیالات کا چرچا ہے، مثلاً مذہب اتحاد و یگانگت سکھاتا ہے۔ اسلام نے خدمت وطن کی تعلیم دی ہے آزادی ہر چیز پر مقدم ہے، ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک سے انسانیت کا ایک نیا نمونہ پیدا ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ارباب نظر خوب جانتے ہیں کہ یہ صرف وقتی نعرے (Slogans) ہیں جن کا دارومدار زیادہ تر خطابت اور زبان آوری پر ہے۔ اگر لوگ بظاہر ان سے خوش ہو جاتے ہیں تو محض اپنے سیاسی مفاد کی خاطر ان سے مطمئن کوئی بھی نہیں، نہ کہنے والے نہ سننے والے جن کی ذہنی خیانت کا انکشاف ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔

لہذا اس ملک میں مسلمانوں کے سامنے ایک ہی راستہ ہے اور وہ اسلام کا لیکن اسلام کا نام سنکر اکثر طبیعتیں دفعتہً مضطرب ہو جاتی ہیں اور ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان ایک غیر اسلامی ملک ہے اس ضمن میں ہمارے عجلت پسند اور کم خیال سیاسئین جن مسائل کی طرف اشارا کرتے ہیں ان کا جواب اگرچہ نہایت آسان ہے مگر اس کے لئے متانت فکر اور ضبط و تحمل کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے مسلمانوں کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ از روئے تعلیمات اسلامی اصولی اور تاریخی دونوں پہلوؤں سے اس امر پر مجبور ہیں کہ قرآن و سنت کے بتلائے ہوئے راستے پر چلیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمارا اجتماعی نظام اصولاً احکام قرآنی اور عملاً یعنی اپنی ہیئت ملی کے اعتبار سے سنت رسول صلعم پر مبنی ہے اسیطرح جس متحد الخیال اور عالمگیر جماعت کی تخلیق ہوئی اس کے پیش نظر ایک ہی نصب العین اور ایک ہی معاشرتی

روح مثلاً اخوت، مساوات، حریت فرد جمہوریت اشتراک اور عفت و پاکیزگی اس کے اندر سرگرم کار ہے لہٰذا مسلمانان عالم کا فرض ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں منشائے شریعت کو پورا کریں۔ یوں بھی ہر ایک مسلمان کو چاہیے کہ اپنی حیات اخروی اور تہذیب انسانی کے اتمام کے لیئے اسی اصول کا پابند رہے۔ گویا اسلامی سیاسیات میں سب سے مقدم ملت کا وجود ہے۔ امم اسلامیہ کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے جن کے مشترک نشوونما کا قدرتاً یہ تقاضا ہے کہ انکی ذات اسلام کی وسیع برادری میں گم ہو جائے نہ ان کے درمیان نسل اور وطن کا فرق ہوگا نہ مقاصد تہذیب کا تفاوت۔ وہ اپنے سیاسی مصالح کے لیئے کوئی مستقل سرحدیں قائم ہی نہیں کر سکتے۔ سہولت معیشت اور آسانی حکومت کا مسئلہ بھی ہمارے اس نصب العین میں حائل نہیں ہو سکتا چاہے امام اور قائد، ہمارا نظام قومی اور ہمارے اولی الامر ہمیں میں سے ہونگے۔ یہ صحیح تصور ہے اتحاد اسلامی کا جس کی صداقت پر اسلام کی پوری تاریخ شاہد ہے۔ اسلام نے ابتدا ہی میں ایک مخصوص و منفرد ملت اور ایک جداگانہ ریاست کی بنا ڈالی جس نے اپنے نظام حکومت میں دوسری قوموں کو جگہ دینے کے باوجود اپنی ہیئت شرعی اور ملی امتیاز قائم رکھا۔ آگے چلکر جب خلافت نے سلطنت کی شکل اختیار کی اور اس کے رد عمل سے امت میں تفریق و انتشار اور باہمی جنگ و جدل کا سلسلہ شروع ہوا تب بھی دول اسلامیہ میں نہ کوئی مستقل حدود قائم ہوئیں نہ سلاطین و ملوک اور خلفا کی موجودگی اس کی مرکزیت کو ختم کر سکی یہ ایک نہایت ہی اہم حقیقت ہے کہ زوال بغداد کے بعد جب اسلام کی یہ مرکزیت مٹ گئی تو اس کے ساتھ ہی اس کی سیاسی طاقت اور ہیئت اجتماعیہ کا زوال بھی شروع ہو گیا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ مسلمان خواہ اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں وہ اپنے لیئے کوئی دوسرا راستہ تجویز ہی نہیں کر سکتے ان میں سے جب کسی نے یہ غلطی کی۔ افراد ہوں یا جماعت۔ وہ اپنی مخصوص حیثیت کو ہمیشہ کے لئے کھو دینگے۔

اگر یہ صحیح ہے تو کیا ہر محب وطن، حریت طلب نیک اور اخلاص مند مسلمان کا یہ فرض نہیں کہ وہ اپنے دل میں ملت اسلامیہ ہند کی تشکیل اور اسکے ارتقا کا صحیح جذبہ رکھتا ہو۔ ایسا کرنے میں وہ کسی سیاسی بدعت یا نزاع و افتراق کا مرتکب نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ خدمت وطن کا وہ راستہ ہے جس پر مسلمان گذشتہ آٹھ سو سال سے گامزن رہے ہیں اس وقت بھی ہمارا تاریخی تسلسل اور دین مقدس اسلام کی بات کا مقتضی ہے کہ ہم ہندوستان میں اپنی سیاسی انفرادیت کو قائم رکھیں یہ اسلامی حکومت کی اسی روش کا نتیجہ تھا۔ دولت مغلیہ کے سیاسی فتنوں کے باوجود۔ کہ ہمارے اہل ملک اسلام

کے غیر فانی احسانات سے مستفید ہوئے تاریخ بتلاتی ہے کہ اسلامی حکومت کے زوال پر جن عالی نظر بزرگوں نے ملت کے بقا و تحفظ کا بیڑا اُٹھایا تھا ان کی مساعی عمل کا دارومدار بھی اسی بات پر تھا۔ یہ اسی ملت کی آرزو تھی جس نے سید احمد خاں اور حالی کے سینوں کو گرمایا۔ ہندوستان کے علماء و صلحا اور اس کے ارباب دانش و حکمت علامہ شبلی نعمانی، لسان العصر اکبر اور دوسرے مشاہیر کو اسی "قوم" کے عروج و اقبال کی تمنا تھی۔ کیا مولانا ابوالکلام حضرت شیخ الہند مرحوم اور مولانا محمد علی نے اپنی تحریر و تقریر میں ہمیشہ اس نصب العین کی حمایت نہیں کی ہے؟ یہ صحیح ہے کہ تحریک خلافت کے بعد ہمارے سیاسی اور اجتماعی مسائل دفعۃً بدل گئے اور ان کا دائرہ نہایت وسیع ہوگیا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اپنی زندگی کے مرکزی تصور سے الگ ہو جائیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملت اسلامیہ ہند کی تشکیل اور اس کے استحکام کے لئے ہمارے ارباب بصیرت مختلف ذرائع عمل پیش کرینگے جنکا تذکرہ طلوع اسلام کی آئندہ اشاعتوں میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہیگا لیکن اگر کسی قوم کے ذرائع اس کے مقصد ہی سے مترتب ہوئے ہیں تو ہماری یہ خواہش غیر مناسب نہ ہوگی کہ ہم اپنے اہل ملت کی توجہ چند ایسی باتوں کی طرف منعطف کرائیں جن کو ہمارے نزدیک اس ملک کی موجودہ حالت اور روزمرہ کی سیاسیات میں بآسانی پورا کیا جا سکتا ہے اور جو ہماری رائے میں اس عظیم الشان مقصد کی ایک اہم اور نہایت ضروری تمہید ہیں

اول یہ کہ ہم اس سیاسی تصوف کو دور کرنے کی کوشش کریں جسنے ہمارے قوائے عمل کو شل کر رکھا ہے جسطرح بعض عجمیت زدہ صوفی محض اپنے زور تخیل سے ان کیفیات کا مزہ اُٹھالیتے تھے جو صعوبت عمل کا نتیجہ ہیں اسیطرح ہندوستانی مسلمان محض اپنے مقصد حیات کے غیر فانی امکانات اور اس کی خوبیوں کے تذکرہ سے خوش ہو جاتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ اس ملک کے سیاسی اور معاشی حالات اور اپنے اجتماعی ماحول کا جائزہ لیں اور اس کے لئے جس دماغی سعی اور ضبط و متانت کی ضرورت ہے اس سے دنیا کی ذی علم اور ہوشمند قوموں کی طرح اپنے ملی ارتقا کا راستہ پیدا کریں اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی قوم میں ایک ہیئت اجتماعیہ پیدا کرنا ہوگی جو اس مقصد کی تلقین و اشاعت اور اس کی عملی ترجمانی کو اپنا مدعائے زندگی قرار دے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے اس تصور کو حکومت اور اہل وطن کے سامنے کامیابی کے ساتھ پیش کر سکیں تاکہ اس ملک کے دستور و آئین اور ہمارے اتحاد و مفاہمت کی بناء اسی اصول پر رہے۔ ملت اسلامیہ ہند کا قیام صرف ایک آزاد ہندوستان ہی میں ممکن ہے۔ لہذا ہندوستانی مسلمانوں کو آزادی کی سچی تڑپ اپنے دل میں رکھنی چاہیئے۔ انھیں ایک معاشی پروگرام اور آئین و قوانین کی دنیا میں ایک مستقل روش اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ جو مقتضائے شریعت کے عین مطابق ہو۔ ایسا کرنے میں شاید ہمیں خود اپنی قوم کے تنگ نظر اور غرض مند عناصر کے خلاف جنگ کرنا پڑے ہمیں دیہات کی اصلاح و تربیت، اسلامی معاشرت کی ترویج، تعلیم و ترقی نسواں کے ساتھ مغربی اور غیر اسلامی خیالات کا مقابلہ اور فرقہ ہائے اسلام کی توجہ ایک دوسرے کی مخالفت کی بجائے اسلام کی صحیح اور سچی تعلیمات کی طرف منعطف کرنا ہے۔ نوجوان قوم کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں نہ سرکاری یونیورسٹیوں میں نہ آزاد قومی درسگاہوں میں ان کے اندر علم و حکمت کا صحیح تجسس اور آرٹ اور ادب کا سچا ذوق پیدا ہونا چاہئے ہماری سیاست اور ہماری صحافت مختصر یہ کہ ہماری ساری زندگی اصلاح طلب ہے۔

حقیقت میں ہمارے سامنے ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ خدا ہمارا مددگار ہو۔ آمین

ختم نبوت

مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری

قرآن کریم نے کھلے کھلے الفاظ میں تصریح کے ساتھ فرمادیا۔

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین ۳۳/۴۰ — محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کی (خاتمہ کی) مہر۔ ختم کے معنے مہر لگانے کے ہیں۔ اور خاتم مہر کہتے ہیں جو کسی شئے یا تحریر کے خاتمے یا انقطاع پر لگائی جاتی ہے۔ اسی سے ختم کے معنے انقطاع کے لئے گئے ہیں اور عام طور پر لفظ ختم انقطاع ہی کے معنے میں بولا جاتا ہے۔ آیت میں خاتم کے لفظ کو بعض لغویوں نے باب مفاعلہ سے فعل ماضی قرار دیا ہے اس صورت میں بھی معنی وہی ہونگے لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ اسم ہے اور اس کے معنے مہر کے ہیں۔ محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم کے اوپر اللہ نے اس سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا جس کا وعدہ ازل میں بنی آدم سے کیا تھا۔

یا بنی آدم اما یاتینکم رسل منکم یقصون علیکم آیاتی فمن اتقی واصلح فلا خوف علیہم ولا ھم یحزنون ۷/۳۵ — اے بنی آدم! اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول آئیں جو تم کو میری آیتیں سنائیں تو جو کوئی تقویٰ اختیار کرے گا اور (ان آیات کے مطابق) اپنے عمل کو ٹھیک کرے گا اُن کے اوپر نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہونگے۔ اس آیت کے مطابق اللہ کی طرف سے رسول آیتیں لیکر سلسلہ وار آتے رہے۔

وکم ارسلنا من نبی فی الاولین ۴۳/۶ ثم ارسلنا رسلنا تترا ۲۳/۴۴ — اور پہلے لوگوں میں ہم نے بہت سے رسول بھیجے۔ پھر ہم نے لگاتار اپنے رسول بھیجے۔

سب کے آخر میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جو اس سلسلہ نبوت کی مہر اور اس کی عمارت کی آخری اینٹ ہیں۔ ان کے بعد کوئی نبی نہیں۔ قرآن کریم نے یہ بھی تصریح کردی کہ وہ دین الٰہی جو بنی آدم کیلئے

ازل سے مقرر تھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کی تکمیل کردی گئی۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت	آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے واسطے
علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا ۵	مکمل کردیا۔ اور تمہارے اوپر اپنی نعمت پوری کردی

اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔

دین الہٰی جو ہر نبی پر اُترا ایک ہی تھا لیکن ہر نبی کے بعد اس کی قوم اس کے لائے ہوئے پیغامات کو تحریف و تخریب سے ضائع کرتی رہی چنانچہ آج کوئی صحیح صحیفہ کسی نبی کی تعلیم کا روئے زمین پر موجود نہیں تا آنکہ قرآن کریم نازل ہوا جس نے جملہ سابقہ آسمانی کتب کی تصدیق بھی کی اور ان کی کل اصلی اور حقیقی تعلیمات کو اپنے اندر شامل کرکے ان کا مہیمن یعنی محافظ بن گیا۔

وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقا	اور ہم نے تیرے اوپر حق کے ساتھ کتاب
لمابین یدیہ من الکتاب ومھیمنا علیہ ۵	اُتاری جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق بھی کرنے

والی ہے اور ان کی نگہبان بھی ہے۔

پھر قرآن کو اللہ نے اپنی حفاظت میں لیکر ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیا۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون ۹/۱۵	ہم نے ہی الذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اسکے محافظ ہیں

یہ الذکر قرآن ہے۔

ان الذین کفروا بالذکر لما جاءھم و	جن لوگوں نے الذکر کا انکار کیا جبکہ وہ انکے
انہ لکتاب عزیز لایاتیہ الباطل من بین یدیہ	پاس آیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ (الذکر) عزت
ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید ۴۱/۴۲	والی کتاب ہے باطل نہ اس کے آگے سے اس کے

پاس پھٹکتا ہے نہ اس کے پیچھے سے سزاوار حمد حکیم کی اُتاری ہوئی۔

اس کے کسی لفظ کو ممکن نہیں ہے کہ کوئی بدل سکے۔

واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک لا مبدل	تیرے رب کی کتاب جو تیرے اوپر اُتاری گئی ہے
لکلماتہ۔ ۲۷/۱۸	اس کی تلاوت کر کوئی اس کے الفاظ کو بدلنے والا نہیں

اب ان تمام قرآنی تعلیمات کو اس ترتیب کے ساتھ ملاحظہ کیجئے۔

(۱) ازل میں اللہ نے بنی آدم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم تمہاری ہدایت کے لئے رسول اور کتاب بھیجتے رہینگے۔

(۲) اس وعدہ کے مطابق رسول من جانب اللہ ہدایت لیکر بنی آدم کے لئے مسلسل آتے رہے۔

(۳) ان ہدایات و آیات کو جو نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے موصول ہوتی رہیں ان کے بعد ان کی قومیں ضائع کرتی رہیں۔

(۴) محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ ہدایت قرآن اُتار کر مکمل کر دی گئی۔ اور وعدہ کیا گیا کہ یہ کتاب اللہ کی حفاظت میں ہے اس کے کسی لفظ کو کوئی نہیں بدل سکتا۔

(۵) محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں جن کے اوپر نبوت کا خاتمہ یعنی انقطاع ہوگیا۔ تعلیم الٰہی مکمل ہوچکی۔ اور ابد تک کے لئے محفوظ کر دی گئی۔ آئندہ کے لئے سلسلہ منقطع کر دیا گیا کہ اب اس کی ضرورت نہ تھی۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ انسان کو اللہ تعالےٰ نے عقل یعنی بصیرت عطا فرمائی ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنی اصلاح و فلاح کو سمجھ سکتا ہے لیکن یہ بصیرت بلا وحی کے نور کے اسیطرح بیکار ہے جیطرح بصارت بلا خارجی روشنی کے اس لئے اللہ نے وحی کے ذریعہ سے ان تعلیمات کو بھیجنے کی کفالت اپنے ذمہ لی جو انسانی بصیرت کو اس کی صحیح فطرت "عبدیت" کیطرف رہنمائی کریں۔ یعنی جن امور میں بصیرت انسانی وحی کی محتاج ہے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ سے وہی وحی موصول ہوتی رہی۔ یہانتک کہ آخر میں خاتم النبیین پر قرآن اُتار کر بنی آدم کو جس قدر وحی والی تعلیمات کی ضرورت تھی اس کی تکمیل کر دی گئی۔ اب وہ مطلقًا اپنی بصیرت کی روشنی کے لئے کسی وحی کے محتاج نہیں رہے بلکہ اسی قرآنی وحی کی روشنی میں اپنی انسانی عقل سے پورا پورا کام حسب منشاءِ الٰہی لے سکتے ہیں۔

لہذا قرآن پر ایمان رکھنے والے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت کا انکار محال ہے اور یہ البداہت شدہ مسئلہ ہے کہ خود عہد رسالت میں مسیلمہ کذاب نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو اس کے کاذب ہونے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا گیا۔ یہانتک کہ شاگردانِ نبوت یعنی صحابہ کرامؓ نے جہاد کرکے اُس کو اور اُسکے

سابقوں کو کیفر کردار کو پہونچا دیا۔ اس کے بعد بھی جب جب اور جہاں جہاں اس قسم کے دعویدار کھڑے ہوئے نہ صرف یہ کہ متفقہ طور پر امت کے نزدیک کذاب قرار پائے بلکہ اچھی طرح انکا قلع قمع کیا گیا۔

تیرہ صدیوں کے اس منصوص۔ متفق علیہ اور اجماعی عقیدہ کے خلاف پنجاب میں مرزا غلام احمد قادیانی باوجود قرآن پر ایمان رکھنے کے ادعا کے اپنی نبوت کا دعویٰ لیکر کھڑے ہوئے۔ مجھے ان کے اس دعوے پر دلیل لانے کی ضرورت نہیں کیونکہ قادیانی جماعت جس کا عقیدہ اور عمل مرزا صاحب کے نوشتوں پر ہے خود اس کا ثبوت ہے۔ وہ ان کو انبیاء سابقین علیہم السلام کی طرح نبی مانتی ہے۔ اور ان کی نبوت کے منکر کو کافر سمجھتی ہے۔

مرزا صاحب موصوف چونکہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اس لئے مسلمانوں کو قائل کرنے کے لئے اس مسئلہ کے متعلق انھوں نے کئی دلیلیں اپنے دل سے جوڑ رکھی تھیں جو دلیلیں نہیں ہیں بلکہ تدبیسات اور آیات قرآنی کی سراسر تحریفات ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

> اللہ جل شانہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم بنایا۔ یعنی آپ کو افاضہ کمال کیلئے مُہر دی جو کسی اور نبی کو ہرگز نہیں دی گئی۔ اسی وجہ سے آپ کا نام خاتم النبیین ٹھیرا۔ یعنی آپکی پیروی کمالات نبوت بخشتی ہے۔ اور آپ کی توجہ نبی تراش ہے۔ حاشیہ حقیقۃ الوحی ص۹۷

غور کرنے کی جگہ ہے۔ قرآن کریم تو یہ کہتا ہے کہ اللہ نے آنحضرت صلعم کو انبیاء کی مُہر بنایا یعنی جس طرح مہر ہر تحریر کے آخر یا انقطاع پر لگتی ہے اسی طرح آپ کے اوپر نبوت کو ختم کر دیا اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ مگر مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اللہ نے افاضہ کمال کیلئے آپ کو مہر دی۔ قرآن میں کہاں مُہر دینے کا ذکر ہے اور پھر یہ کہ وہ افاضہ کمال کے لئے دی گئی۔ یہ خالص تحریف ہے۔ اور یہ لکھنا کہ حضور کی توجہ نبی تراش ہے شرک جلی ہے۔ کیونکہ آپ کا فریضہ جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے صرف کلام الہٰی کی تبلیغ تھی۔ ایمان یا ہدایت کا افاضہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے نہ کہ رسول کی طرف سے۔ قرآن مجید نے صاف طور سے اس کی تصریح کر دی ہے۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللهَ — تو جس کو دوست رکھے اس کو ہدایت نہیں دے سکتا

یھدی من یشاء ۵۶/۲۸ — مگر اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

ان کی دوسری دلیل اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔

افسوس حال کے نادان مسلمانوں نے اپنے نبی مکرم کا کچھ قدر نہ کیا۔ اور ہر ایک بات میں ٹھوکر کھائی، وہ ختم نبوت کے ایسے معنے کرتے ہیں جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو نکلتی ہے نہ تعریف گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس پاک میں افاضہ اور تکمیل نفوس کے لئے قوت نہ تھی اور وہ خشک شریعت سکھانے آئے تھے حالانکہ اللہ تعالٰے اس امت کو یہ دعا سکھاتا ہے کہ اھدنا الصراط المستقیم۔ صراط الذین انعمت علیہم۔ پس اگر یہ امت پہلے نبیوں کی وارث نہیں اور اس انعام سے ان کو کچھ حصہ نہیں تو یہ دعا کیوں سکھائی" حاشیہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱

میں پہلے اس آیت کا صحیح مفہوم بیان کر دوں۔

اھدنا الصراط المستقیم۔ صراط الذین انعمت علیہم۔ ۵/۱ — ہم کو سیدھا راستہ دکھا ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام فرمایا ہے۔

اللہ نے جن پر انعام فرمایا ہے اُن کی تفصیل اس آیت میں ہے۔

ومن یطع اللہ والرسول فاولٰئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصٰلحین ۶۹/۴ — اور جو کوئی اللہ اور رسول کی اطاعت کریگا تو یہی لوگ اُن کے ساتھ ہونگے جنپر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء صدیقین، شہداء اور صالحین۔

جن کے اوپر اللہ کا انعام ہے وہ چار قسم کے لوگ ہیں۔ ان چاروں کے راستہ کی جو رشد اور ہدایت کا ہے دعا مانگنے کی سورہ فاتحہ میں جو ہر نماز اور ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے نہ کہ طلب نبوت کی۔ اور یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ یہ امت پہلے نبیوں کی نبوت کی وارث ہے؟ وراثت تو صرف کتاب کی ہے جس کی تصریح قرآن میں صاف صاف کر دی گئی ہے۔

ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا ۳۲/۳۵ — پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا اپنے بندوں میں سے ان لوگوں کو جنکو برگزیدہ کیا۔

نبوت یا اسکے کسی حصہ کی وراثت کا خیال از روئے قرآن حتماً باطل ہے صرف زمانہ حال کے نادان مسلمان ہی نہیں بلکہ زمانہ گذشتہ کے تمام صلحا رو اولیا بلکہ صحابۂ کرامؓ بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے ورنہ مسیلمہ کذاب کو قتل نہ کرتے۔ حال کے نادان مسلمانوں کے ساتھ اس عقیدہ کو مخصوص کرنا محض تدلیس ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس پاک میں افاضہ اور تکمیل نفوس کی قوت سے یہ استدلال کرنا کہ آپ کے فیضان سے لوگ نبی بن سکتے ہیں بجائیکہ خود آپ کی زندگی میں آپ کی اس قوت سے کسی کو نبوت کا شرف حاصل نہ ہو سکا کس قدر غلط ہے۔

ایک تیسری دلیل جس کو قادیانی بڑے شد و مد سے پیش کیا کرتے ہیں یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے۔

یابنی آدم اما یاتینکم رسل منکم یقصون علیکم ایاتی فمن اتقیٰ و اصلح فلا خوف علیہم ولا ھم یحزنون ۳۵/۷	اے بنی آدم! اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول آئیں اور تم کو میری آیتیں سنائیں تو جو کوئی تقویٰ اختیار کرے گا اور اپنے عمل کو ٹھیک کرلے گا اُن پر کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ اندوہگین ہونگے۔

اس سے ثابت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انبیاء آتے رہیں گے۔ کیونکہ "یاتین" میں نون تاکید ثقیلہ ہے جو مضارع کو زمانہ مستقبل کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے اور یہ آیت چونکہ قرآن میں اُتری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر نازل ہوئی ہے اس لئے انکے بعد انبیاء کا آنا ثابت ہو گیا۔ مگر انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ یہ قول کس وقت کا ہے اور اس کے مخاطب کون لوگ تھے۔

اس آیت میں خطاب بنی آدم سے ہے نہ کہ امت محمدیہ سے۔ اور یہ اُس وقت کہی گئی ہے جبکہ آدم کا ہبوط ہوا ہے۔ یہ مضمون قرآن میں تین جگہ بیان کیا گیا ہے اور تینوں جگہ قصہ ابلیس و آدم کے ساتھ ساتھ ہے۔ ایک تو آیت مذکورہ بالا میں جو سورۂ اعراف میں ہے۔ دوسرے سورۂ بقرہ میں۔

قلنا اھبطوا منھا جمیعا۔ فاما یاتینکم منی ھدیً فمن تبع ھدای۔ فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ۳۸/۲	ہم نے کہا کہ تم سب وہاں سے نیچے اُترو سو اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت پہونچے تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا اُن پر نہ

کوئی خوف ہوگا نہ وہ اندوہگین ہونگے۔

پھر سورہ طٰہٰ میں ہے

قال اھبطا منھا جمیعًا بعضکم لبعض عدو فاما یاتینکم منی ھدی فمن اتبع ھدای فلا یضل ولا یشقٰی ۱۲۱/۲۰	اللہ نے فرمایا کہ وہاں سے تم دونوں سب کے سب (ذریۃ آدم والبلیس) نیچے اُترو۔ ایک دوسرے کے دشمن سو اگر میری طرف سے ہدایت پہونچے تو جو میری

ہدایت کی پیروی کریگا وہ نہ گمراہ ہوگا نہ بدبخت۔

ان دونوں آیتوں میں ہدیٰ کا لفظ ہے اور سورہ اعراف میں رُسل و آیات کا۔ جو دراصل ہدیٰ کی تفصیل ہے کہ وہ رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ سے آئیگی۔ چنانچہ ہبوط کے بعد اللہ تعالےٰ سلسلہ وار رسولوں کو بھیجتا رہا۔ جو اُس کی اُتاری ہوئی آیتیں لوگوں کو پڑھ پڑھ کر سناتے رہے۔ یہانتک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آکر یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس لئے "یاتینّ" کے لفظ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی جن کو قرآن نے تصریح کے ساتھ خاتم الانبیا قرار دیا ہے۔ نبی آتے رہیں گے قرآن کی سخت نافہمی ہے اور اس کی روشن تعلیم کو مسخ کرنا ہے۔

الغرض مذکورہ بالا اور اسی قسم کے لاطائل قیاسات اور بے معنے دلائل سے جو تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔ ختمِ نبوت کی حقیقت پر پردہ ڈالنے اور مرزا صاحب کی نبوت کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح ظلّی نبی۔ مجازی نبی اور بروزی نبی وغیرہ کے الفاظ صرف اس خود ساختہ نبوت کو پردہ خفا میں کھینچنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ جن کے قرآن کی رو سے حتماً کوئی معانی نہیں۔ نبوت ایک حقیقت ثابتہ ہے وہاں مجاز کا گزر نہیں نہ اس کا کوئی ظل ہے نہ بروز۔ وہ خود ایک بارز اور غیر مستتر صفت ہے۔ اس سے جو لوگ بذریعہ اطاعت اور اتباع کے اثر پذیر ہوتے ہیں وہ مومن اور صالح کہے جا سکتے ہیں نہ کہ نبی۔

یہاں تک جو کچھ بحث تھی وہ قرآن کریم کی رو سے تھی۔ اب عقلی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس مدعی نبوت نے کوئی تعلیم ایسی پیش نہیں کی جس میں ادنیٰ شائبہ بھی نبوت کا ہو۔ ساری عمر کا سرمایہ صرف چند پیشین گوئیاں ہیں جن میں سے جو جسقدر زیادہ جزم و ادعا کے ساتھ کی گئی۔ اسیقدر زیادہ غلط ثابت ہوئی۔

یہاںتک کہ ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء میں اشتہار دیا کہ

اب میں تیری جناب میں ملتجی ہوں کہ مجھ میں اور ثناء اللہ میں سچا فیصلہ فرما۔ اور وہ جو تیری نگاہ میں در حقیقت مفسد اور کذاب ہے اُس کو صادق کی زندگی ہی میں اس دنیا سے اُٹھا لے۔

تقدیر نے اس معاملہ میں سچا فیصلہ کر دیا جس سے اہل بصیرت پر حق روشن ہوگیا یعنی اسی مدت میں جو اس دعا میں مقرر کی گئی تھی مرزا صاحب کو ہیضہ کی وبا سے وفات دیدی اور مولانا ثناء اللہ ابوالوفا کو زندہ رکھا جو آج تک مرزائیوں کی تردید کر رہے ہیں۔

رہا مجدد کا عقیدہ جو ایک مذہب جماعت مرزا صاحب کے متعلق رکھتی ہے تو اس عقیدہ کو قرآنی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر اس امت میں ایک مجدد پیدا کرتا ہے جو اس کے دین کی تجدید کرتا ہے لیکن یہ روایت حقیقت میں اُس وقت کے مسلمانوں کی ذہنیت کا اظہار کرتی ہے جبکہ پہلی صدی ہجری کے خاتمہ اور دوسری صدی کے آغاز پر حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوگئے تھے جنھوں نے بنی امیہ کے "مظالم" کو مٹا کر پھر ایک بار عہد فاروقی کو تازہ کر دیا تھا ورنہ دین اللہ کے مقرر کئے ہوئے ان اٹل اور پختہ اصولوں کا نام ہے جو مطلقاً تجدید پذیر نہیں ہیں نہ ان کے لئے مجدد کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مجدد کے عقیدہ کی تلقین نہیں کی۔ یہی کیفیت "مہدی موعود" کے عقیدہ کی ہے۔ اسکا بھی قرآن کے کسی حرف سے ثبوت نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تو محض مایوسی کی حالت کا عقیدہ ہے جس کو اہل بیت یعنی علی کرم اللہ وجہ کی اولاد نے سلطنت سے محروم اور ناامید ہوجانے کے بعد ڈھارس بندھائے رکھنے کے لئے قائم کیا تھا کہ ہم ہی سے ایک مہدی پیدا ہوگا جو روئے زمین پر حکومت کریگا۔ یہی نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھکر رجعت کا عقیدہ قائم کیا کہ ہمارے ائمہ پھر دنیا میں واپس آکر اپنے دشمنوں کو فنا کرینگے اور قرنہا قرن تک حکومت کرینگے۔ حالانکہ یہ قرآن کے سراسر خلاف ہے اس میں بار بار تصریح کر دی گئی ہے کہ جو گیا اُس کی واپسی نہیں۔ ادلم یروا کم اھلکنا قبلہم من القرون انہم الیہم لا یرجعون۔ ۳۱/۳۶

حاصل یہ ہے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی قسم کی نبوت یا مجددیت یا مہدویت کا عقیدہ کسی شخص کی بابت رکھنا شخصیت پرستی ہے جس سے قرآن اور اسلام کو قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ ایسے مدعی جب جب کھڑے ہوئے ہیں امت میں تفریق اور فتنہ کے باعث ہوئے ہیں۔

سیاست معاشی

ہم ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ممنون ہیں کہ انھوں نے باوجود اپنی مصروفیتوں کے طلوع اسلام کے لئے کچھ نہ کچھ وقت نکال ہی لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اُسکی اہمیت ظاہر ہے۔ البتہ افسوس یہ ہے کہ چند "تیز" اشارات کے سوا اصل بحث پر انھوں نے بہت کم اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ شاید پھر کبھی۔ مدیر

انسان ہمیشہ مل جل کر جماعت میں رہا ہے۔ اور جماعت کے نظام نے اس کی معیشت پر اثر ڈالا ہے۔ جماعتی زندگی کی ابتدائی شکلوں میں بھی معاش فراہم کرنے کا کام اکیلے آدمی کے سپرد نہیں رہا بلکہ اس میں خاندان، قبیلہ یعنی جماعت نے برابر مدد یا مداخلت کی ہے۔ مثلاً شکارگاہوں اور چراگاہوں کی تلاش میں، آلات کی تیاری میں غنیمت کی تقسیم میں وغیرہ۔ جوں جوں آبادی بڑھتی ہے، معاشی زندگی میں تخصیص کار اور تقسیم عمل کو فروغ ہوتا ہے بہتر طریقہائے کار کا چلن ہوتا ہے تو معاشی زندگی پر جماعت کا اثر اور بڑھتا ہے۔ تمدنی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے تنہا انسان کی قوتیں بس نہیں کرتیں، ایک دوسرے کا سہارا لینا، اور دوسرے سے سہارا لینا ہے باہمی ربط و اتحاد کی یہ خواہش اور ضرورت تمدنی زندگی کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ اجتماعی اعمال میں اتحاد قویٰ کی تاثیر اور اس کے لئے ضبط و نظم کی ضرورت آدمی پر پہلے دن سے روشن ہوتی ہے۔ اس لئے ہیئت اجتماعی شروع ہی سے انفرادی معیشت کے لئے ہادی و رہنما، مانع یا مددگار کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان ارکان کی تعداد جن پر یہ ہیئت اجتماعی مشتمل ہے جیسقدر بڑھتی ہے اور ان کے مشترکہ اعمال کے امکانات میں جتنا اضافہ ہوتا ہے اسی قدر اس بات کی ضرورت بھی بڑھتی ہے کہ نظم جماعت کو مضبوط بنایا جائے کسی قوی رہنما قوت کی قیادت حاصل کی جائے جو مقررہ قواعد و ہدایات کی اطاعت کرا سکے اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو دبا سکے۔ اسی طرح غالباً حکمراں اور ریاست کا وجود شروع ہوتا ہے۔ اور معیشت کے کاروبار میں منظم ہیئت اجتماعی، بالخصوص ریاست، کی مداخلت کو سیاست معاشی کہتے ہیں۔

ریاست کی یہ مداخلت ہمیشہ اس دعوے کے ساتھ اور اکثر شاید اس نیت کے ساتھ ہوتی ہے کہ اس کی

تدابیر سے ہیئت اجتماعی کو بہ حیثیت کل زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔ مگر جوں جوں تمدن وتہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر نظم زندگی اور طبائع انسانی میں تنوع شروع ہو جاتا ہے۔ افریقہ کے نیم وحشی جبشیوں میں عموماً مذاق، صلاحیت ذہنی استعداد، جسمانی کارکردگی کا بہت کم تفاوت محسوس ہوتا ہے۔ ان کی ضرورتیں اور حاجتیں بہت کچھ یکساں ہوتی ہیں۔ لیکن ذرا زیادہ متمدن جماعت کو دیکھئے تو ایک اور دوسرے رکن میں صلاحیتوں کا تباین، مذاق کا اختلاف اور ضرورتوں کا تفاوت پہلی نظر میں سامنے آجائیگا۔ اس تنوع کے باعث ایک ہی ہیئت اجتماعی کے افراد اور گروہوں میں اختلاف اغراض ومقاصد اور اس کی وجہ سے کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ مختلف پیشوں کو، مختلف طریقہائے کار کو، مختلف نظامہائے معیشت کو ہیئت اجتماعی سے مختلف قسم کا تعلق ہوتا ہے اور اس لئے ان کے اغراض بھی باہم مختلف ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی غرض کی تائید میں ہیئت اجتماعی یعنی ریاست کی مداخلت اور مدد چاہتا ہے۔ لیکن ایک کی بھلائی میں دوسرے کی برائی اور ایک کے فائدہ میں دوسرے کا نقصان ہوتا ہے۔ مثلاً مال خریدنے والے چاہتے ہیں کہ قیمتیں مندی ہوں، اور مال بنانے والے اس فکر میں رہتے ہیں کہ بازار تیز ہو۔ کارخانے والے مصارف دولت آفرینی کو گھٹانے کے لئے شرح اُجرت کو نیچے گرانا چاہتے ہیں تو محنت کش مزدور اس ادھیڑبن میں ہیں کہ اسے اوپر چڑھائیں۔ مال تیار کرنے والے اور استعمال کرنے والے چاہتے ہیں کہ باہم براہ راست و بلا واسطہ تعلق قایم کرلیں، بیچ کے دوکاندار ان کے اس ربط باہمی کو بڑی شبہ کی نظروں سے دیکھتا ہے کہ ایسا ہو گیا تو اس غریب کا تو خاتمہ ہی ہے۔ چھوٹے دوکاندار بڑے بڑے مخزنوں کے قیام کے مخالف ہیں اور چھوٹے کاریگر بڑے بڑے کارخانوں کے۔ زراعت والوں کا بھلا اس میں ہے کہ غلّہ اور دوسری زرعی پیداوار کی قیمت بڑھے، چاہے اس سے شہر والوں کے مصارف کتنے ہی بڑھ جائیں اور صنعت کو اجناس خام کتنی ہی مہنگی پڑیں۔ سوت کی درآمد پر محصول لگا کر اگر سوت کاتنے والوں کو سہارا دیجئے تو سوت بننے والے جولاہے چلا اٹھتے ہیں، لوہے کی صنعت کی تائین کی فکر کیجئے تو ریل کی کمپنیاں اپنے پیشے میں نقصان دکھانے لگتی ہیں۔ ٹرام اور بس جاری کیجئے تو یکہ تانگہ والے چیختے ہیں، قوم کی مجموعی قوت دولت آفرینی کو بڑھانے اور اس کی تجارت خارجہ کو فروغ دینے کے لئے بہتر بن صنعت اور بڑے پیمانے پر دولت آفرینی کی حمایت کیجئے

تو قوم کا ایک بڑا حصہ یعنی اس کے چھوٹے کاریگر اور معمولی کاروبار کرنے والے ایک عرصہ کے لئے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں

مذکورہ صدر مثالوں سے یہ واضح ہو گیا کہ اگر ریاست اپنی سیاست معاشی میں اپنے اجزا ترکیبی کے علیحدہ علیحدہ فلاح و بہبود کا خیال رکھے تو اس سیاست میں یکجہتی اور ہم آہنگی کا ہونا ناممکن ہے۔ یا اگر اس سیاست کے تعین میں ہیئت اجتماعی کا کوئی مخصوص حصہ ہی موثر ہو تو ظاہر ہے کہ وہ پوری ریاست اور اس کی ساری قوت کو اپنی اغراض کا تابع بنانے کی کوشش کرے گا۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ دوسرے گروہ بھی برابر تاک میں رہینگے کہ جب موقع پائیں قوت حاصل کر کے سیاست معاشی کا رخ اپنی بہبود کی طرف پھیر دیں اور اپنے فائدہ کے لئے اس غلطی کے مرتکب ہوں جو دوسروں سے سرزد ہوتی تھی تو ان کے لئے سخت بے اطمینانی اور شکایت کا باعث تھی یہی وجہ ہے کہ ریاستوں کی سیاست معاشی میں لیا اوقات تسلسل و ہم آہنگی نہیں پائی جاتی، بلکہ متضاد عناصر کے باری باری اقتدار پانے سے کبھی اس کا رُخ ایک طرف ہوتا ہے کبھی دوسری طرف۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ ان افراد، طبقات اور مختلف پیشوں اور گروہوں کی تنگ نظری سے قطع نظر کل ہیئت اجتماعی اپنے لئے اور اپنے ارکین کے لئے کوئی مقصد یا مقاصد ایسے متعین کر سکے جو اس کے نزدیک اور اس کے ارکان کی اکثریت کے نزدیک بہر حال قابلِ حصول ہوں۔ ریاست بس ان مقاصد کی حمایت کرے، چاہے کسی خاص گروہ کو اس سے عارضی فائدہ اور کسی دوسرے کو عارضی نقصان پہنچے انسان جس کا ہر فعل کسی مقصدہ حصول کے لئے ہی ہوتا ہے وہ اپنے اس اجتماعی عمل کے لئے کسی مقصد اعلیٰ کے تعین کی خواہش کیسے نہ کرے اور اس کے امکان کا یقین کیوں نہ رکھے؟

چنانچہ جب شیت کو زندگی میں یہ درجہ حاصل نہ تھا جو آج ہے، یعنی جب اس خادم حیات پر مخدوم کا گمان نہ ہوتا تھا، تو یہ ہمیشہ ان مقاصد کی پابند رہی جو جماعت کے لئے مذہب، فلسفہ، یا رسم و رواج سے متعین ہو جاتے تھے۔ حیات و کائنات کا جو تصور ساری زندگی پر حاوی ہوتا تھا اسی کے زیرِ نگیں معیشت بھی رہتی تھی۔ مگر اس کے بعد بھی، جب معیشت نے ذرا زیادہ اہمیت حاصل کر لی، زندگی بجائے ایک وحدت کے بہت سے اجزا میں منقسم سی ہو گئی اور ان اجزا میں سب سے اہم جزو بعضوں کی نظر میں، معیشت کو مانا جانے لگا تو اس وقت بھی یہ خواہش کارفرما رہی کہ معیشت کے لئے کوئی معیار مقرر ہو۔ فلسفی اور معاشی برابر اس ادھیڑ بن میں

لگے رہے کہ معیشت کے اس نقشہ کا پتہ چلائیں جو انسانی زندگی کی غایت حقیقی اور کائنات میں اس کے وظیفہ مخصوص سے ہم آہنگ ہو۔

مقصد حیات اور غایت کائنات کا پتہ چلانے کے لئے بعض لوگوں نے جنہیں اہلِ فطرت کا گروہ کہہ سکتے ہیں صحیفۂ قدرت اور حیاتِ انسانی کے مطالعہ کو ذریعہ بنایا۔ بعضوں نے جنہیں اہلِ عقل کہہ سکتے ہیں، تجربہ سے بے نیاز ہو کر اور عقل نظری کی طرح عقل عملی کی بھی کچھ بدیہیات مان کر خالص عقلیت کی روشنی میں معیاری معیشت کے نقشے ترتیب دئے، معیشت کے مقاصد معین کئے اور انہیں مقاصد کے لئے صحیح اور موثر وسائل اختیار کرنا سیاست معاشی کا وظیفہ قرار دیا۔

میں نے ایک اور جگہ (معاشیات مقصد ومنہاج) معیشت کے لئے معیار مقرر کرنے کی ان کوششوں پر مفصل تنقید کی ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ مقاصد معیشت کا علم نہ تجربہ سے ممکن ہے نہ صحیح معیشت کی کوئی شکل ایسی بدیہی ہے کہ اُسی کو اچھا مان لیا جائے۔ بدیہی تو ظاہر ہے کہ اس لئے نہیں کہ معاشی زندگی کے بے شمار امکانات سمجھ میں آتے ہیں، بلکہ تاریخ کے صفحات ان گنت قسم کی معاشی زندگی کے ذکر سے پُر ہیں۔ بہت سے نقشے بن بن کر بگڑے ہیں اور نہ جانے کتنے اور بنیں اور بگڑیں۔ ان میں کسی کو ترجیح دیجئے تو وجہ ترجیح کیا ہو، اور بداہت میں بہت سی شکلوں کا امکان ہی کیسے ہو؟ تجربہ یوں عاجز ہے کہ اسے بس اس سے سروکار ہے کہ کیا ہے اور کیا ہو چکا ہے۔ لیکن کسی چیز کے وقوع سے اس کی پسندیدگی کی دلیل کیسے نکل سکتی ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ جہاں زندگی کے کسی شعبہ کے لئے اعلیٰ ترین مقصد کے تعین کی ضرورت پڑی تو صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ لازماً ورا رِ تجربہ ہے، چنانچہ معیشت کا مقصد اعلیٰ بھی کوئی غیر معاشی ماورا رِ تجربہ مقصد ہوتا ہے۔ ہر شخص کا جو تصور کائنات ہوتا ہے وہ اسی کے مطابق معیشت کا خاکہ بناتا ہے اور اسی کو صحیح جانتا ہے۔ معیشت کے مقاصد کا سوال دراصل تقدیرِ انسانیت کے مسئلہ کے جواب پر منحصر ہے۔ اور اس کے جواب بے شمار ہیں۔ اس کا جواب دینے والے انسانوں میں کوئی رُخ بہ دنیا ہے کوئی رو بہ عقبیٰ، کوئی یاس مسلک، کوئی آس مشرب، کوئی زندگی کو سینے سے لگانے والا، اس کی پابندیوں کی زنجیروں کو چومنے والا، کوئی زندگی سے بیزار، اس کے بندھن کاٹنے کے درپے؛ چنانچہ بدیہی اور تجربی علم دونوں کی راہ مقصد معیشت کے تعین کے لئے ہم پر بند ہے۔

پھر کیا اس کے انکشاف کی کوئی اور راہ نہیں؟ خدا کا شکر ہے کہ ہے۔ وہی جو ماورا، تجربہ حقیقتوں کے علم کی راہ ہے یعنی مابعد الطبیعی علم کی وجدانی راہ اور مذہبی علم کی الہامی راہ۔ پہلی میں گمراہی کا بڑا کھٹکا ہے، دوسری صراط مستقیم ہے، پہلی کا وسیلہ ذہن کی فلسفیانہ صلاحیت کا عمل ہے، دوسری کا وحی والہام۔ پہلے میں چہرۂ حقیقت کا بس ایک رخ سامنے آتا ہے۔ دوسرے میں کُل چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ پہلے میں محرکِ عمل بننے کی قوت کم ملکہ نہیں ہوتی۔ دوسرا، صاحبِ الہام کی شخصیت، پیام کی وضاحت اور اس پر یقین کے استحکام کی وجہ سے نسلاً بعد نسل انسانوں کے لئے عمل کا سرچشمہ بنجاتا ہے۔

اور تاریخ پر نظر ڈال جائے۔ ہوا بھی یہی ہے کہ جب کبھی محض کسی شخص یا چھوٹے سے گروہ کے فوری اغراض سے آگے بڑھ کر پوری ہیئت اجتماعی کے لئے، پورے ملک اور قوم، یا پوری انسانیت کے لئے معیشت کا کوئی مقصد پیش کیا گیا ہے تو اس کا تعین غیر عقلی (خلاف عقل نہیں!) طور پر ہی ہوا ہے۔ آج بھی دنیا میں جو گروہ معاشی زندگی کو یکسر بدلنے کا خواہاں ہے اور اس کی تشکیل نو کے لئے دل وجان سے ساعی نظر آتا ہے۔ (یعنی اشتراکی گروہ) اس کا مقصد بھی باوجود ہزار ادعائے علمیت وعقلیت، ایک جذباتی غیر عقلی مطالبہ ہے، جو ایک غیر عقلی نفرت اور ایک غیر عقلی محبت کی آمیزش سے بنا ہے۔ سچ ہے کہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ انہوں نے علمی تحقیق اور حکمی تجسس سے، واقعات کے مشاہدہ اور اسباب وعلل کی تحلیل کے مراحل طے کر کے معیشت کے اس رازِ سربستہ کا سراغ لگا لیا ہے۔ کہ جس طرح یقینی طور پر پتھر اوپر سے نیچے گرتا ہے اسی طرح املاک کم سے کم تر ہاتھوں میں مجتمع ہوتی جائے گی، نفع طلبی کی غیر عقلی ذہنیت کے غیر عقلی عمل سے ہیئت اجتماعی کو تھوڑے عرصہ بعد ایسے انتشارات معاشی سے دوچار ہونا پڑے گا کہ نظام معیشت بہت دن انکی تاب نہ لاسکیگا اور کوئی چاہے نہ چاہے قوانین قدرت اپنا عمل جاری رکھیں گے اور سرمایہ داری کا نظام خود بخود تباہ ہو جائے گا۔ دوسروں کی املاک چھینے والے خود املاک سے محروم کئے جائینگے اور نادار مزدوروں کی کثیر جماعت سب کچھ رکھنے والوں کے قلیل طبقے کو ہٹا کر معیشت کے تمام نظام پر اپنا تسلّط قایم کریگی اب آپ لاکھ بتایئے کہ اجتماعِ ملکیت کے قانون قدرت نے معیشت کے متعدد گوشوں میں اپنا عمل کیا، بلکہ بعض جگہ، مثلاً ملکیت آراضی کے معاملے میں، تو اس کے متضاد صورتیں ظہور میں آئیں، لیکن

آپ کا سب کچھ کہنا بے سود ہے، اس حکمی اور علمی اور تجربی حقیقت پر عقیدہ جیسا کا تیسا قایم رہتا ہے۔ کسادبازاری کے انتشارات سے سرمایہ داری نے کیا کیا فوائد حاصل نہ کئے اور اپنی ذہنیت کے دو اہم پہلوؤں کے لئے یعنی تجارتی توسیع اور تاجرانہ تنظیم کے لئے کیا کچھ مواقع نہ نکالے، بازار کے اسی مدوجزر، اسی تیزی اور مندے پن کے باعث ہی کیسی کچھ ترقی نہ کی۔ آپ تاریخی شہادتیں اور تجربہ کو جی بھر کے پیش کیجئے۔ مگر یہ تجربہ پر مبنی عقیدہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ آپ تاریخ کی خالص معاشی تعبیر کے خلاف ہزار دلائل لائیے، طبقات کی جنگ کے نظریہ کو جس طرح چاہئے مجروح کیجئے۔ لیکن انقلاب اشتراکی کے ماننے والے کو اس عقیدہ سے نہ ہٹا سکیگا۔ اس لئے کہ اس کا یہ دعوے کہ وہ کسی علمی اور تجربی نظریہ کا قائل ہے دراصل ایک راسخ غیر عقلی عقیدہ کے لئے بس ایک آڑ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں حقیقت یہ ہے کہ اشتراک جدید کے بانیان مذہب سب کے سب جماعتی حس رکھنے والے لوگ تھے جن میں جماعتی زندگی سے بے اطمینانی میں اسے چھوڑ دینے کی جگہ اس کی اصلاح کا جذبہ پیدا ہوتا ہے؟ پھر یہ سب کے سب مصنوعی قسم کے آدمی تھے جو عضوی طور پر اپنے ماحول کا جزو نہیں ہوتے بلکہ پورے طور پر اس سے وابستہ ہوتے ہیں جنہیں ہر جگہ مسائل دکھائی دیتے ہیں اور حل کہیں نہیں سوجھتا، جو منطقی اصولوں پر اڑتے ہیں اور زندگی کے لوچ سے بے بہرہ ہوتے ہیں، جن میں تمنا کی بے تابی اتنی شدید ہوتی ہے کہ عاشقی کی صبر طلبی سمجھ میں نہیں آتی، جو زندگی میں ناکامی و نامرادی کے باعث غم و غصہ سے بھرے ہوتے ہیں اور تاریکی حیات میں شمع محبت کی روشنی سے محرومی کے باعث جن کا دل نفرت سے لبریز ہوتا ہے، اور اس سے ایک عالمگیر تنقید اور بے اطمینانی اور ہر چیز کی طرف سے ایک منفی رویہ ان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ ان صفات کے ساتھ غیر معمولی ذہنی صلاحیتیں رکھنے والے ہیں۔ جبلی و جذباتی ہونے کی جگہ تفکر و تعقل کے لوگ ہیں۔ یہ جب مزدور طبقے کی بےبسی کو دیکھتے ہیں، سرمایہ داری کے اُٹھتے ہوئے طوفان کی پہلی رو میں ان کی مصیبت کا مشاہدہ کرتے ہیں، ان کی ذہنی سطح آنکتے ہیں ان کے دلی خیالات و جذبات کا اندازہ لگاتے ہیں تو بس یہی ایک راہ نہیں نظر آتی ہے کہ نیم علمی نظریوں کا ایک نظام بنائیں اس سے مذہبی عقیدہ کا کام لیں اور اس بے سروسامان فوج کو آخری کامیابی کے علمی اور عقلی طور پر ناگزیر ہونے کی بشارت دیدیں۔

بات ذرا دور جا پڑی۔ کہنا یہ تھا کہ کل زندگی کی طرح معیشت کے لئے بھی مقاصد کا تعین عقل اور

تجربہ سے نہیں ہوتا بلکہ غیر عقلی (خلافِ عقل نہیں) طریقوں پر ہوتا ہے۔ اگر اس غیر عقلی تعین کے لئے نام نہاد تجربی علم اور بداہت عقلی کی غلط آڑ لی جا سکتی ہے تو صحیح الہامی تعلیمات کو اس کی اساس کیوں نہیں بنایا جا سکتا؟ اور کسی الہام کو صحیح ماننے والے کے لئے سوا اس کے چارہ بھی کیا ہے کہ جو مقاصد اس الہامی تعلیم نے کل زندگی اور اس کے شعبوں کے لئے مقرر کر دئے ہیں، ان میں جو ربط و نظم مقرر کر دیا ہے ان کی اعتباری اہمیت کا جو انداز دیدیا ہے اس کی پیروی کرے اور واقعی زندگی کو اس معیار کے قریب لانے میں ساعی ہو۔ مثلاً مسلمان اگر اپنے دین کو سچا مانتے ہیں اور اسے کل زندگی پر حاوی جانتے ہیں تو ان کے لئے سوا اس کے اور کون راہ ہے کہ اپنے دین کی تعلیمات کو صحیح صحیح معلوم کریں، الہام سے اور صاحبِ الہامؑ کے عمل سے معیشت کے مقاصد کے متعلق جو ہدایت انہیں مل سکتی ہو اُسے حاصل کر کے اس کی روشنی میں موجودہ زندگی کی تعبیر کریں، اسے اس منزل کی طرف لے جانے کے وسائل سوچیں اور اختیار کریں جس کی ہدایت انہیں کی گئی ہے۔

مسلمانانِ ہند برابر اس بات پر مصر ہیں کہ اس ملک میں جس کی محبت میں وہ کسی دوسرے سے پیچھے نہیں، وہ اپنے تمدن اور تہذیب کو قایم رکھنا چاہتے ہیں اور اس کے تحفظ کے لئے ہر طرح کی ضمانت چاہتے ہیں۔ ہر چند کہ اس خیال کے بہتیرے موئدین کو خالص مسلم مجمعوں میں انگریزی لباس کے اندر اور انگریزی زبان میں غریب مسلم ہندی کی معاشرت اور اس کی مایہ ناز اردو زبان کے تحفظ کی ضرورت پر رطب اللسان پایا گیا ہے اور اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ اس خیال کے حامی لسے کہیں اپنی شخصی اغراض کا آلہ نہ بنانا چاہتے ہوں، پھر بھی ان کی ریاکاری یا فریب دہی سے ان کے خیال کی صداقت میں تو فرق نہیں آتا۔ مسلمان بیشک اپنے دین کو ساری زندگی کے لئے شمع ہدایت مانتے ہیں اور اس لئے ہر شعبہ زندگی میں اس سے روشنی چاہتے اور پاتے ہیں۔ اس لئے اگر وہ ہندوستان میں اپنا تمدنی وجود قایم رکھنا چاہتے ہیں تو اُن کا فرض ہے کہ معیشت کے اہم شعبہ میں بھی اپنے دین کی صحیح تعلیم کو ملک کے سامنے پیش کریں اور اس کے قبول کرانے کی تدابیر اختیار کریں۔ جس طرح مسلمان ملک کی سیاست پر اثر ڈالنا چاہتے ہیں اسی طرح ان کی ہر سیاسی جماعت کا فرض ہے کہ معیشت سے متعلق بھی ان کا ایک

لائحہ عمل ہو جسے ان کی سیاست معاشی کا پروگرام کہا جا سکے اور جو تمام ملک کے سامنے برابر پیش کیا جائے اور جسے منوانے کی سبیل نکالی جائے۔

ہاں اس میں یہ دھوکہ نہ ہو کہ اگر آج کوئی خاص مسلم طبقہ سیاسی مباحث میں پیش پیش ہے تو وہ اپنی اغراض کی پابندی کو اسلام کا مطالبہ بنا کر مسلمانوں اور دوسرے اہلِ ملک کی آنکھوں میں خاک جھونکے۔ مسلم سیاست معاشی کسی خاص مسلم گروہ کے اغراض کی ترجمانی کا نام نہیں۔ بلکہ دین اسلام کے معینہ مقاصد معاشی کے حصول کے لئے وسائل اختیار کرنے سے عبارت ہے۔ لہٰذا مسلم علمائے دین، مسلم مقنن اور مسلم معاشین کا فرض ہے کہ وہ قرآن مبین اور حیات طیبہ نبویؐ سے معیشت کی غایت زندگی میں اس کے درجے اور اہمیت، معاشی اعمال کی ذہنیت اور ایسے ہی دوسرے امور اہم کے متعلق بصیرت حاصل کرے۔ پھر تاریخ فقہی میں اس پر نظر ڈالے کہ یہ مقاصد، یہ کارفرما ذہنیت کس کس طرح تشکل ہوئی، اور حالات کے تغیر سے اس میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ پھر موجودہ زندگی میں اس بصیرت کی بنا پر معلوم کرے کہ الہام کے معینہ مقاصد کا تقاضہ اسوقت کیا ہے اور اس کے حصول کے لئے کیا تدابیر عمل میں لائی چاہئیں۔ گمان ہے کہ ہندوستان کی معیشت میں اگلے بیس تیس سال نہایت غور و فکر اور تغیر و تبدل کا زمانہ ثابت ہونگے۔ اگر مسلمان واقعی سیاست معاشی کا کوئی لائحہ عمل رکھتے ہوں تو اسے روبراہ لانے کی کوشش میں وہ صرف اپنے دین کی صحیح پیروی کی سعادت ہی حاصل نہ کرینگے بلکہ اپنے دیس کو بھی معاشی تنظیم کی صحیح راہ بتا کر اس کی ایسی خدمت کرینگے جس سے اس میں ان کی باعزت وجود کی بہت بڑی ضمانت پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے کہ باعزت وجود محض حقوق طلب کرنے سے یا انہیں حاصل کرنے سے بھی یقینی نہیں ہوتا۔ اس کی سب سے قوی ضمانت یہ ہے کہ ان کے وجود سے ہیئت اجتماعی کو فائدہ پہنچے اور اپنی خدمت سے یہ اپنے وجود کو ہندوستانی سماج کے لئے انمول اور بے بہا بنا دیں۔ میرا یقین ہے کہ مسلمان اگر اپنے دین کی سچی معاشی تعلیم کو اسوقت ملک میں پیش کریں تو ایک عظیم الشان خدمت کا موقع ان کے سامنے ہے۔ اس کی تفصیل کا افسوس کہ اسوقت محل نہیں۔ پھر کبھی۔

اُردو ادب کی اسلامی تحریک

(سید نصیر احمد بی اے)

عہد حاضر کے اسلامی ادب یعنی ادبیات اقوام اسلامیہ میں اس تحریک کا مطالعہ نہایت دلچسپ ہے جو انیسویں صدی کے آخر میں رونما ہوئی اور جو اس وقت صرف ہندوستان ہی کے مسلمانوں تک محدود ہے۔ ہمارا مطلب ہے اردو ادب کی اسلامی تحریک سے۔

اگر زمانہ حال کے عربی، ایرانی اور ترکی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے ایک نہایت ہی گہرے وطنی شعور اور ذہنی بیداری کا پتہ چلتا ہے۔ عرب، ایرانی اور ترک شعرا نے اپنے مخصوص سیاسی اور اجتماعی مسائل پر نظر ڈالی ہے۔ یہ ان کے جوش عمل اور ولولہ حریت کی دلیل ہے۔ لیکن ان کا شعور ملی بہر حال محدود ہے اور اسلام کے ماضی وحال سے بطور ایک نظام تمدن یا اجتماعی تحریک کے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سیاسی اعتبار سے ان کی ہستی جس طرح معرض خطر میں تھی اس کے ماتحت انھیں فرصت ہی نہیں ملی کہ وہ اپنے وقتی مسائل کے علاوہ ان امور پر بھی نظر ڈالتے جن سے بحیثیت ایک عالمگیر ملت کے مسلمانوں کا وجود قائم ہے۔

برعکس اس کے ہندوستان کے اسلامی ادب میں یہ مخصوص شعور نہایت گہرے دینی اور ملی جذبات کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا حالی سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ ان کی نگاہ اپنے گرد وپیش اور مخصوص حالات سے نکل کر اسلام کے ماضی وحال اور بطور ایک عظیم الشان تاریخی حقیقت کے اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتی رہی۔ آگے چلکر ان احساسات میں بتدریج وسعت پیدا ہوتی گئی۔ اسلام کی گذشتہ عظمت واقبال اور موجودہ تنزل کے ان خیالات میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا کہ اسلام کا اصل حیات اس کا سیاسی اور اجتماعی نصب العین اور اس کی تعلیمات کیا ہیں؟ اس نے بنی نوع انسان کو جو پیام دیا ہے۔ اس کی دینی اور اخلاقی حیثیت کیا ہے؟ اس لحاظ سے تاریخ کا وہ انقلاب جو ظہور اسلام کا مرہون منت ہے کون سی عمرانی تحریک کا باعث ہوا۔ اسلامی تمدن کی روح کیا ہے اور مغرب سے اس کی آویزش کیا

نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ یہ اور اسی قسم کے سینکڑوں مسائل ہندوستانی شعرا کے پیش نظر ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اتحاد اسلامی کے نہایت عمیق اور خالص جذبات اور ملت کی عظمت و کامرانی کا یقین

ہم نے ابھی عرض کیا تھا کہ اس تحریک کی ابتدا حالی سے ہوئی۔ حالی غالب کے شاگرد تھے۔ اُستاد اور شاگرد دونوں سچے شاعر ہیں۔ صحیح معنوں میں شاعر۔ ایک کی نظر زندگی کی گہرائیوں اور انسانی واردات کے نہایت ہی گہرے اور نازک پہلوؤں پر تھی۔ دوسرے نے دہلی کے حسرتناک انقلاب کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے ملت کے عروج اور دولت و ثروت کا چراغ گل ہوا۔ شان و شوکت خاک میں مل گئی۔ عزت و توقیر جاتی رہی اور ساری قوم پر ایک گوشے سے لیکر دوسرے گوشے تک تاریکی اور اُداسی چھا گئی اس حالت میں عشق و عاشقی کا کسے ہوش رہتا ہے۔ خود فرماتے ہیں "قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے ہیں شریف خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے سب کی چاروں طرف دُہائی ہے۔ اخلاق بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگور گھٹا۔ تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔"

عبرت و ناکامی کا یہی احساس تھا جس نے بالآخر مسدس کی شکل اختیار کی۔ اسلام کیا تھا اور کیا ہو گیا عہد جاہلیت میں عرب کی کیا کیفیت تھی۔ رسول ہاشمی صلعم کے فیض نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ وہ قوم جس کا متاع ہستی اونٹوں کے چند گلوں اور قتل و غارتگری تک محدود تھا اب اقوام عالم کی رہنما اور علم و حکمت کی دولت سے مالا مال تھی ـــــ اخلاق و روحانیت کا ایک لازوال سرچشمہ جس سے ساری دنیا سیراب ہوتی تھی۔

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اُٹھی ... پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دور دور اُس کی پہونچی ... جو ٹیکس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اُس سے محروم آبی نہ خاکی ... ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی
بہار اب جو دُنیا میں آئی ہوئی ہے ... یہ سب پود اُنھیں کی لگائی ہوئی ہے
نہیں اس طبق پہ کوئی بر اعظم ... نہ ہو جس میں اُن کی عمارات محکم
عرب۔ ہند و مصر۔ اندلس و شام و دیلم ... بناؤں سے ہے اُنکی معمور عالم

سرکوہ آدم سے تا کوہ بیضا — جہاں جاؤ گے کھوج پاؤ گے اُن کا

اس طرح قوم کے ماضی و حال کا جو مرقع مسدس نے پیش کیا تھا اس کے بعد شاعر کے دل میں اُمت کے اس حصے کا خیال پیدا ہوتا ہے جو ہندوستان میں آباد ہوئی۔ مسلمان بیشک ہندوستان ہی کے باشندے ہیں لیکن مسلمان ہندوستان کے باہر سے بھی آئے تھے۔ ان کا آنا کیسا شاندار تھا مگر ان کا انجام کیسا حسرتناک ہوا۔ شکوۂ ہند کا ایک ایک شعر اس احساس سے لبریز ہے۔ حالی کا درد بھرا دل مسلمانان ہند کی بربادی پر تڑپ اُٹھتا ہے۔ اور وہ ان کے کھوئے ہوئے عظمت و جلال کا ماتم اس سوز و گداز سے کرتے ہیں کہ اس سے پہلے اس کی کوئی نظیر ہماری زبان میں نہیں ملتی۔ انھوں نے اس تباہی اور بربادی پر ایک سچے مسلمان کی طرح کس خلوص اور منت کے ساتھ سرکار دو عالم کے حضور میں فریاد کی ہے کہ

اے خاصۂ خاصان رُسل وقت دعا ہے — اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

لیکن حالی ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو مصیبت اور پریشانی میں صرف دو آنسو بہا کر اپنے دل کی تسلی کر لیتے ہیں۔ ان کا ذہن قوم کے دکھ درد کے لئے دوا کا متلاشی تھا وہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ ملت کا زوال کیونکر ہوا۔ مسلمانوں کی اخلاقی پستی کے تمام مظاہر ان کے سامنے ہیں، ہماری معاشرت کس قدر ذلیل ہے وہ پرانا علم و حکمت، وہ دانائی اور عقلمندی، شوق تجسس عزم اور حوصلہ سب رخصت ہوا بے خوفی ڈر اور ہمت یاس سے بدل گئی۔ بزرگوں کی صحبتیں فیض و برکت سے خالی ہوگئیں۔ نوجوان بے راہ رو ہیں۔ عورتیں جاہل اور زبوں حال علما غافل آخر اس صورت حالات کا علاج کیا ہے؟ تعلیم اتفاق سے اسی وقت سرسید نے تعلیم کا بیڑا اُٹھایا اور حالی کو یقین ہو گیا کہ جہالت سے بڑھ کر انسان کا اور کوئی دشمن نہیں۔ تعلیم عبارت ہے حصول علم یعنی معرفت ذات اور زندگی کے شعور سے بیشک تعلیم ہی وہ نسخہ ہے جو قوم کے حق میں اکسیر ثابت ہوگا۔ یہ ایک ایسا انکشاف تھا جس سے حالی کی مایوسی اُمید سے بدل گئی۔ اب وہ دل و جان سے سید احمد خاں کے ساتھ تھے۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ زوال و نکبت کی تاریکی میں ایک خضر وقت مسلمانوں کی دستگیری کے لئے پیدا ہو گیا۔ گویا سرسید جس تحریک کے علمبردار تھے، حالی اس کے نقیب ہیں۔ علیگڈھ کی کامیابی میں سرسید کی شخصیت اور حالی کی شاعری دونوں کا حصہ ہے چونکہ شاعر کو اس تحریک میں ابتدائی

ملنے کے آثار نظر آتے ہیں لہذا وہ انتہائی ذوق و شوق سے اپنے ہم قوموں کو اس کی دعوت دیتا ہے۔ سید احمد خاں اور علیگڈھ کی تعریف میں حالی کی نظمیں نہایت شاندار اور امید و کامیابی سے لبریز ہیں۔ اُنکی وہ نظم

دور سے اُمید نے جھلکی سی اِک دکھلائی ہے　　ایک کشتی ڈوبتے بیڑے کو لینے آئی ہے

یا مسلمانوں کی تعلیم کا یہ ترکیب بند سید احمد خاں اور علیگڈھ کی کسقدر مخلصانہ تعریف ہے

زمانہ دیر سے چلا رہا ہے اے مسلمانو　　کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز پہچانو
ہوئے ہیں شر دل لوگوں کے تو ڈھارس بندھاتا ہے　　اُمیدیں اُن کی استقلال سے اپنے بڑھاتا ہے
شدائد میں تحمل خاص میراث انبیا کی ہے　　جو تو آل محمد ہے تو سب صدمے اُٹھاتا رہ

عزیزو حق کی رحمت ہے یہ پیر ناتواں ہم میں　　پھر ایسا پیر ہے ہم میں نہ کوئی نوجوان ہم میں
نہ کی سید کے منصوبوں کی گر تائید یاروں نے　　تو پھر ہرگز سنبھلنے کی نہیں تاب و تواں ہم میں

یہ دار العلم سد راہ آسیب زماں ہوگا　　اسی دار الشفا میں بخت پیر اپنا جواں ہوگا
اگر رکھتے ہیں دل پہلو میں اگر یہ چمن دیکھیں　　ریاضِ قوم کا فصلِ خزاں میں بانکپن دیکھیں

حالی اس امر کو بھی خوب جانتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے علاوہ اور قومیں آباد ہیں اور نہ بھی ہوں تو کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہندوستان کی خوشحالی اور اُس کی شان و شوکت اسلام ہی کی رہون منت ہے کیا اسلام اہل ہند کے لئے مودت و محبت اور وسعت و رواداری کا ایک زبردست پیام نہیں لایا تھا۔ قوموں کا اختلاف و انشقاق اُن کی ضد، تعصب اور تنگدلی کبھی اچھے نتائج پیدا نہیں کرتی۔ انھوں نے پھوٹ اور ایکے کے مناظرے اور بعض دوسری نظموں میں اپنے اہل وطن کو اخلاق و انسانیت کا کتنا بلند سبق دیا ہے۔ بایں ہمہ حالی شروع سے لیکر آخر تک ایک اسلامی شاعر ہیں ملت اسلامیہ ہند کے پہلے شاعر۔ اس لئے کہ ان کے ذہن میں مسلمانان ہند کی ایک آزاد اور ممتاز قومیت کا تصور موجود ہے۔ ان کے اشعار سے بار بار اس تمنا کا اظہار ہوتا ہے کہ جس طرح زمانہ سابق میں مسلمانوں کو ہندستان میں عروج و اقبال حاصل تھا اسی طرح وہ پھر ایک معزز و ممتاز قوم بنکر اسلام کے مخصوص تہذیب و تمدن کا پیام اپنے اہل وطن تک پہنچائیں اتحاد و مفاہمت کی خواہش اور ہندوستان کی محبت انکی وسیع القلبی اور سچی اسلامی روح کی ترجمان ہے

کیونکہ اسلام کا ابتداہی سے یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ اختلاف مسلک کے باوجود دوسری قوموں اور ملتوں کو اپنے دامن میں پناہ دے اور جہاں جائے امن و عافیت کا پیغام لیکر جائے۔ حالی کو خوب معلوم تھا کہ یہ مقصد اسلام اور اسلامی شعائر کی حفاظت ہی سے حاصل ہوسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی نہایت ہی پاکیزہ اور تقویٰ پسند شخصیت کی طرح ان کی شاعری پر بھی ایمان اور دینداری کا غلبہ ہے۔ وہ اس ارتدادِ ذہنی سے محفوظ تھے جس نے آج کل ہندوستانی قومیت اور وطنیت یا ہند کی اسلامی معاشرت کی غیر اسلامی اصطلاحیں وضع کر رکھی ہیں اور جس کا نتیجہ ملت کے لئے انتشار اور پراگندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

حالی کے ساتھ اکبر کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ اکبر حالی کے معاصر ہیں اور تحریک علیگڈھ کے مخالف نہیں تو ناقد ضرور۔ کہنا غلط ہوگا کہ اکبر کے پیش نظر کوئی خاص تخیل نہیں تھا وہ ہر نئی چیز کی مخالفت کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اکبر سیاسی مفکر ہیں اور نہ اسلامی تہذیب و تمدن پر انھوں نے بطور ایک نظام حیات کے غور کیا ہے لیکن ان کی تخریب و استہزا پسند روش تعمیر اور متانت سے معمور ہے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ دنیا میں مسلمان بننے کے لئے کس قسم کی روح چاہیے۔ لہٰذا ان کی ظرافت اور بے پناہ تنقید کے باعث جو بعض اوقات شاید ناگوار حد تک پہنچ جاتی تھی ہمیں ان کی شاعرانہ عظمت کو کم نہیں کرنا چاہیے قوم کو اکبر کی ہمیشہ ضرورت رہے گی اور حالی کی زبردست شاعری کسیطرح انکے لطائف سے بیرون ہند کے مسلمان بھی مستفیض ہوا کرینگے۔

ان کی نظر اس تصادم پر ہے جو اسلامی معاشرت اور مغرب کے درمیان ہوا۔ وہ غلبۂ "تفرنج" سے خائف تھے۔ ڈر یہ تھا کہ مسلمانوں کی شکست خوردہ اور منتشر جماعت کہیں مغرب کی ظاہری آب و تاب اور ملحدانہ ترغیبات کا شکار نہ ہوجائے۔ اگر نوجوانوں میں مغربی اخلاق اور مغرب کے معاشرتی تصورات پھیل گئے تو کیا ہوگا۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ تعلیم اور مذہب کی علیحدگی ضرور ایک نہ ایک دن رنگ لائیگی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ "نئی روشنی" کے طوفان بدتمیزی میں بہ جائیں۔ لہٰذا سید احمد خاں کے خلوص کا اعتراف کرتے ہوئے بھی وہ ہمیشہ ان سے پوچھتے تھے کہ آخر جو اس روش کی جو انھوں نے تعلیم اور ترقی کا نام لیکر اختیار کی ہے انتہا کہاں ہوگی؟ اکبر تحریک علیگڈھ کے نہایت سچے اور دیانتدار مبصر ہیں اور ان کی شاعری اسلامی اخلاق اور اسلامی سیرت کی طرف سے ایک زبردست صدائے احتجاج ہے۔ اس غیر ارادی مگر سراسر

غلط طرزِ عمل کے خلاف جو ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات میں مسلمانوں نے اختیار کیا تھا۔ اگر باوجود اس کے لوگ یہ کہیں کہ اکبر کی نظر کسی خاص چیز پر نہیں تو یہ انکی کم سوادی اور کم فہمی ہے تمام عالم اسلامی میں اس تصادم کے علمی نتائج کا نقشہ کسی نے نہیں کھینچا جو اسلام اور مغرب کے درمیان جاری ہے علمی اور دینی لحاظ سے مغربی خیالات کی تردید بھی ہوئی اور مخالفت بھی لیکن یہ امر کہ اس غیر طبعی امتزاج اور بے معنی ترکیب سے جو تقلید فرنگ کے زیر اثر رونما ہے کیا کیا مضحکہ خیز صورتیں پیدا ہونگی اور اس سے مسلمانوں کا احساس دینی ان کے اخلاق و عادات اور ان کا جذبہ ملی کس طرح مسخ ہو جائیگا اس کی ہو بہو اور جیتی جاگتی تصویر اکبر ہی کے لطائف اور بے مثل بذلہ سنجیوں میں نظر آسکتی ہے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ساحرہ مغرب کی صحبت میں بیٹھکر تعلیم یافتہ مسلمان کس طرح اپنے آپ کو کھو دیتا ہے۔ پھر وہ عہد جدید کے ان سیاسی اور معاشی عوامل سے بھی بے خبر نہیں تھے جن کی زد میں آکر قوم کے رہنماؤں اور اس کے علماء و فضلا نے نوجوانوں سے بڑھکر اپنی ہنسی اُڑائی ہے اکبر شعور ملی کا استحکام چاہتے تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ اس وقت جو کشمکش "قدیم و جدید" کے درمیان جاری ہے اس میں اسلام کامیاب ہو کر نکلے۔ بایں ہمہ ان کے دل پر امید سے بڑھکر یاس کا غلبہ ہے۔ کبھی وہ بظاہر ہنستے ہوئے کہتے ہیں۔

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

برق گر جائے گی اک دن اور اُڑ جائیگی بھاپ
دیکھنا۔ بچو بچائے رکھنا اپنے آپ کو

اور کبھی غایت نو امیدی میں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ۔

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہونگے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے

نہ خاتونوں میں رہجائیگی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہونگے

خبر دیتی ہے تحریک ہوا تبدیل موسم کی
کھلینگے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہونگے

عقائد پر قیامت آئیگی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہونگے

بہت ہونگے مغنی نغمۂ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہونگے اس لئے بے تال و سم ہونگے

ہنسیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اکبرؔ
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

حالی کی طرح اکبر کا ذہن بھی مسلمانان ہند کے سیاسی اور اجتماعی ماحول سے بے خبر نہیں۔ انھوں نے شیخ و برہمن کے نزاع، اردو ہندی کی چپقلش اور انگریز او نیٹیو کے فرق کو نہایت مزے لے لے کر بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر ہندوستان کے ملکی معاملات اور وقت کی مصلحتوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اکبر کی شخصیت شروع سے لیکر آخر تک ایک نہایت ہی کامیاب اور باکمال صاحب فن کی ہے۔ تقلید و مرعوبیت سے جو عقلی اور دماغی اختلال رونما ہوتے ہیں ان کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو ایک حقیقی اُستاد فن کا قلم جس لطافت سے بیان کر سکتا ہے اس سے کچھ اکبر ہی کی ذہانت اور طباعی عہدہ برا ہو سکتی تھی اکبر کی شوخیاں اور چلبلا پن۔ ان کا خندۂ زیر لب، ان کی ہنسی اور قہقے ــــ الفاظ و حروف کے دلچسپ "کیری کیچر" اور کارٹون" ــــ اکبر کے سوا کہاں ملیں گے۔ بیشک اکبر اپنے طرز سخن کا پہلا اور آخری شاعر ہے جس کی مثال ادب عالیہ میں کہیں مشکل ہی سے مل سکتی ہے! حالی اور اکبر دونوں کی شاعری نے عین وقت پر مسلمانوں کی رہنمائی کی ایک ہندوستان میں اسلامی قومیت کی تشکیل کا آرزومند ہے۔ دوسرا مسلمانوں کی تہذیب اور ان کی معاشرت کے حفظ و بقا کا متمنی۔

اکبر اور حالی کے بعد اقبال کی غیر معمولی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ لیکن اقبال کی ذات میں یہ اسلامی تحریک اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی ہے خالص شاعری کی نظر سے دیکھئے تب بھی ان کا مقام اس درجہ بلند ہے کہ وہاں کسی دوسرے شاعر کی رسائی نہیں ہوتی۔ وہ صرف اسلامی ہندوستان یا اسلام ہی کے شاعر نہیں بلکہ مشرق اور تمام بنی نوع انسان کے شاعر ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں مطلق باک نہیں کہ اقبال کا وجود عہد حاضر کا ایک عجیب و غریب مظہر ہے۔ جس کی توجیہ کسی طرح ممکن نہیں۔ ان کی شاعری اور ان کا فلسفہ ایسا ہی حیرت انگیز ہے جس طرح ان کی بلند اور زبردست شخصیت "بانگ درا" سے لیکر "بال جبریل" کی اشاعت تک انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس قدر مختلف النوع اسقدر بلند، اسقدر عمیق اور کمال فن کا ایسا بدیع اور اچھوتا نمونہ ہے جس کی تشریح کے لئے ایک دوسرے اقبال ہی کی ضرورت ہے۔ اسلامی ہندوستان انکی ذات پر خصوصیت کے ساتھ فخر کرے گا۔ انھوں نے کس خوبی کے ساتھ عالم اسلام کی گہری سے گہری آرزوؤں اور اس کی خوابیدہ روح کا اظہار کیا ہے معلوم ہوتا ہے اسلام کے ماضی و حال اور اس کے مستقبل کی ساری

کشاکش ہمت کران کے حساس دل میں جمع ہوگئی ہے صرف حالی اور اکبر ہی کو دیکھا جائے تو اردو ادب کی یہ خالص اسلامی تحریک زمانۂ حال کی ایرانی اور عربی شاعری سے ممتاز ہے اور اقبال کا کلام تو بجائے خود ایک مستقل ادب ہے۔ البتہ یہ ممکن نہیں کہ اس نہایت ہی مختصر اور سرسری خاکے میں ہم ان کی شاعری کے مختلف عناصر کا تجزیہ کرسکیں۔ اس کے لئے ایک الگ بحث کی ضرورت ہے۔ گرامی مرحوم نے کیا خوب کہا تھا

در دیدۂ معنی نگراں حضرت اقبال　　　پیمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

ناانصافی ہوگی اگر یہاں دو اور شخصیتوں کا ذکر نہ کیا جائے جنھیں تاریخ ادب اردو میں ایک غیر فانی درجہ حاصل ہے۔ ہمارا مطلب ہے علامہ شبلی نعمانی مرحوم اور مولانا ظفر علی خاں سے۔ شبلی کی فنی قابلیت اور ان کی شاعرانہ عظمت کیلئے ان کا فارسی کلام ایک ایسی شہادت ہے۔ جس کی موجودگی میں یہ ماننا لازم آتا ہے کہ اگر وہ اپنے کثیر اور مختلف النوع مشاغل کے بدلے صرف شعر و سخن ہی کا راستہ اختیار کرتے تب بھی ان کا مرتبہ نہایت بلند ہوتا اس لئے کہ وہ اپنے جذبات قلب کا جو دھندلا سا عکس ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں اس کی نزاکت اور دلآویزی مسلم ہے۔ افسوس یہ ہے کہ وصاف اور کشاف کے نام سے الہلال میں لیگ، کانگریس اور مسلم یونیورسٹی کے معاملات پر چند نظموں کے سوا انھوں نے اس مبحث پر اور کچھ نہ لکھا۔ البتہ ظفر علیخاں نے ابتدائی رنگ سخن کو چھوڑ کر ہندوستان کی اسلامی سیاست ہی کو مستقلاً اپنا موضوع بنالیا ہے۔ ان کا کلام اگرچہ سراسر ہنگامی اور وقتی مسائل تک محدود ہے لیکن یہ ہندوستان کی گذشتہ بیس سالہ سیاست کی ایک ایسی دلچسپ اور پرلطف تاریخ ہے جس پر اہل ذوق وجد کرتے ہیں۔ ہجاگوئی — فحاشی اور گالی گلوچ نہیں جس کو اب تک اہل زبان ہجو قرار دیتے آئے ہیں — متین سنجیدہ اور نہایت پرمعنی ہجاگوئی میں ظفر علی خاں کا جواب اردو کیا کسی دوسری زبان میں بھی مشکل سے ملے گا۔ زبان پر ان کو جو غیر معمولی قدرت حاصل ہے اس کا ہر شخص کو اعتراف ہے۔ انکی لاجواب ذہانت اور جدت طبع، ان کی حیرت انگیز لسانی اور نکتہ رسی اور ان کی بے مثل شوخی اور سخن آرائی مسلم۔ ظفر علیخاں کے الفاظ اور ان کے حروف نوک تیغ سے بھی زیادہ تیز ہیں۔ ان کی پھبتیاں اور ان کے چٹکلے جس قدر دلچسپ اور خندہ آور ہیں تعریف و تشنیع اور طنز و مذمت میں ان کا لب و لہجہ اتنا ہی تلخ اور درشت

ہو جاتا ہے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ظفر علی خاں کی ہجوؤں سے جماعت کا کوئی طبقہ محفوظ نہیں رہا ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی بے پناہ نکتہ چینیاں ملت کے بیکار اور رفتہ جو عنصر کے خلاف ایک نہایت کامیاب اور موثر حربہ ہیں جس نے ملک سے ہمیشہ خراج تحسین وصول کیا ہے۔ ان کی ہجو ملیح تو اور بھی پر لطف ہے۔ ہندو مسلم کی سیاست فہمی کے متعلق کہتے ہیں۔

کبھی ہندو ہے گردش میں کبھی مسلم ہے چکر میں — پھرا کرتا ہے یوں ہی چرخ ناہموار کا لٹو
عنایت کی نظر اس وقت منشی رام جی پر ہے — انہی آنکھوں کا تارا تھے مگر کل تک میاں چٹو

۲۱-۱۹۲۰ء کے ہنگامہ قید و بند میں ستیاگرہ کی ایک نئی صورت یہ پیدا ہوئی کہ مولانا داؤد غزنوی گوشہ زنداں میں بیٹھے ہیں، پولیس کھڑی ہے کہ مولانا چلئے عدالت سے طلبی کا حکم آیا ہے لیکن مولانا ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے آخر پولیس کے سپاہی انھیں اپنے کاندھوں پر اٹھا کر لے گئے اس مضحکہ خیز واقعہ کے متعلق ظفر علی خاں کہتے ہیں

دی حضرت داؤد کو چڈی جو پولیس نے — احباب نے پوچھا بہ تعجب کہ یہ کیا ہے

مولانا کا جواب یہ تھا

ہے مجھکو خوشی یہ کہ مری ران کے نیچے — خود حضرت عیسٰیؑ کی سواری کا گدھا ہے

مقام مسرت ہے کہ اردو ادب کا یہ تحریک اب عام ہو رہی ہے اور جسے دیکھئے اسی رنگ سخن کو اختیار کرتا جاتا ہے یہ گویا اس بات کی علامت ہے کہ اسلام کی ذہنی بیداری کا حلقہ عوام تک وسیع ہو رہا ہے اور گویا عتباً فن اس طرح کسی حقیقی اور موثر شاعری کی تخلیق ناممکن ہے کیونکہ تقلید اور نقالی فن نہیں بلکہ ابتذال فن کی دلیل بایں ہمہ یہ ہماری دلی اور دماغی تربیت کا ایک ضروری مرحلہ ہے جس سے گریز ناممکن تھا۔ حفیظ کا شاہنامہ البتہ مستثنیات میں سے ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آگے چل کر ان کے ملی احساسات کیا شکل اختیار کرتے ہیں۔

مسائل حاضرہ

قضیۂ شہید گنج

اس وقت مسلمانوں کے لئے سب سے اہم مسئلہ مسجد شہید گنج کی واگذاری کا ہے اور بنظر بہ انصاف ان کا یہ مطالبہ قانوناً اور اخلاقاً ہر اعتبار سے حق بجانب ہے اس لئے کہ جب تک کسی وقف یا دینی عمارت کا وجود قائم ہے اس کی نوعیت وقف اور دینی عمارت ہی کی رہے گی۔ زمانے کی دستبرد اور حوادث روزگار سے اس میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی تغیرات اور حکومت کے رد و بدل سے قوموں کے اکثر نشانات مٹ گئے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی وقف یا معبد کسی دوسری قوم کے ناجائز تصرف میں ہے تو اس کے حصول یا بازیافت کی خواہش کو بغض و تعصب پر محمول کیا جائے۔ مسجد "شہید گنج" عبداللہ خاں کوتوال شہر کے حکم سے تعمیر ہوئی (۱۰۴۴ھ) یہ زمانہ شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب غازی کا تھا۔ سید عبداللطیف، رائے بہادر کنہیا لال، صاحب تحقیقات چشتیہ اور دوسرے مورخین نے اپنی اپنی تصانیف میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اور آنریبل مسٹر جسٹس ہلٹن پریذیڈنٹ گردوارہ ٹریبونل کو اس امر کا اعتراف ہے کہ متنازعہ فیہ "مسجد" مسجد ہی تھی۔ قانون کی نظر زیادہ تر اس پہلو پر رہی ہے کہ اس مسجد کا استعمال بحیثیت مسجد ایک مدت سے موقوف ہے۔ لیکن اس عدم استعمال کا سبب صرف اس قدر ہے کہ اسلامی قوت کے زوال پر جب لاہور کی تخریب و انہدام کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو اس سے بہت کم عمارات محفوظ رہیں۔ یہ زمانہ سکھ مثل داروں کا تھا اور انھوں نے مساجد و مقابر سے حسب مطلب جو چاہا کام لیا۔ رفتہ رفتہ سکھوں کے اس قتل کی یاد میں جو دیوان لکھپت رائے کی طرف منسوب ہے "شہید گنج" یعنی نخاس کے اس حصے کو جہاں میر منو کی عدالت، مزار حضرت شاہ کاکو، عبداللہ خاں کا حمام اور مسجد واقع تھیں غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے یہاں ایک گردوارہ اور سمادھیں تعمیر کیں اس لئے کہ یہ سکھوں کا قتلگاہ لہذا ایک مقدس مقام تھا لیکن اس زمانے میں بھی اکالی سکھوں کی سرکشی میں کوئی فرق نہیں آیا اور جیسا کہ لطیف کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے

یہی مقام ——— شہید گنج - ان کا ملجا و ماوا تھا۔ بہرحال اس طرح مسجد شہید اور اس کی ملحقہ عمارات کو جو نقصان پہنچا اُس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ البتہ مسجد اس زمانے میں بھی مسجد ہی رہی یہاں تک کہ آنریبل مسٹر جسٹس ملٹن کے سامنے بیان کیا گیا تھا کہ ۱۹۱۹ء میں سکھوں نے مسلمانوں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ اس میں نماز ادا کر سکتے ہیں
اندریں حالات یہ کچھ مشکل نہیں تھا کہ اتحاد و مروت کے نام پر سکھ اس مسجد کو مسلمانوں کے حوالے کر دیتے یا اور نہیں تو کم از کم اس کے انہدام اور بے حرمتی ہی سے محترز رہتے۔ ہندوؤں کی رائے عامہ اس معاملہ میں مسلمانوں کا ساتھ دے سکتی تھی لیکن انھوں نے وہ کیا جو اخلاق و رواداری کے آئین میں سب سے بڑا جرم ہے اور جس پر حکومت پنجاب نے ان کا قانونی حق "تسلیم کرنے کے باوجود انہیں متنبہ بھی کیا تھا۔ یہاں لاہور کے ان المناک حوادث کا تذکرہ بے سود ہے جو تکلیف و مصیبت کے ان ایام میں پیش آئے اس لئے کہ یہ غفلت تدبر اور دوراندیشی کا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ صورت حالات کیوں پیش آتی جسکا ہمیں بجا طور پر رنج ہے۔ بہرکیف اب سوال مستقبل کا ہے۔ جہانتک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ دیکھکر اطمینان ہوتا ہے کہ ۲۰ ستمبر کو یوم شہید گنج کے سلسلے میں انھوں نے جو زبردست مظاہرے ہندوستان کے اطراف و جوانب میں کئے ہیں وہ انکی امن پسندی اور ضبط و تحمل کا ایک ناقابل انکار ثبوت ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر انھوں نے اپنے جذبات کو بے قابو نہ ہونے دیا اور مصلحت وقت کا لحاظ رکھا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام رہیں۔

ہماری رائے میں اس وقت مسلمانوں کی توجہ سب سے پہلے ان مسائل پر ہونی چاہیے جن کو واقعات نے ایک مرتبہ پھر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ان میں سب سے اہم مسئلہ استحکام ملت کا ہے۔ بیشک ملت کا استحکام ایک "امارت" یعنی اجزائے ملت کی ترتیب اور ربط انضباط کے لئے ایک ہیئت اجتماعیہ ایک ملی ادارے کا مقتضی ہے لیکن اس کا قیام صرف اسوقت ممکن ہے جب ہمارے ذہن میں نظام قومی اور ملت کے مقاصد و مصالح کا صحیح تصور موجود ہو۔ لہٰذا اس وقت جب یہ احساس عام ہو چلا ہے ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ملت کی تمام جماعتیں اور اس کے مختلف الخیال عناصر ایک مرکز پر جمع ہو جائیں اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو جمہور کے اندر ایک حقیقی اور صحیح امارت قائم ہو جائے۔ بغیر اس کے حیات ملی کا وجود ناممکن ہے۔ اس سے ہمیں اس نہایت ہی اہم اور پیچیدہ مسئلہ کو بھی حل کرنے میں مدد ملے گی کہ ہم اپنے برادران وطن سے کس اصول پر مفاہمت کریں۔ ہماری رائے میں مسلمانوں کی آئندہ زندگی کے لئے اس امر کا تصفیہ بہت ضروری ہے ورنہ مخلوط انتخاب اور مخلوط قومیت کے ساتھ مخلوط تعلیم اور مخلوط معاشرت کی جو تحریک اس وقت رائج ہے اس کا نتیجہ مسلمانوں کے لئے کچھ بہت زیادہ خوشگوار نہیں ہوگا۔ ان دو نہایت اہم اور بنیادی مسائل کے

علاوہ ہمیں اپنے اوقاف - مساجد و مقابر وغیرہ کی حفاظت اور قانون شریعت کے نفاذ کے لئے رائے عامہ کی تربیت کرنی چاہیئے۔ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ وہ اس معاملہ میں ہر طرح مسلمانوں کی امداد پر آمادہ ہے ہمیں یقین ہے کہ کونسل اور اسمبلی کے مسلمان اراکین اس اشارے سے فائدہ اٹھا کر اس نہایت اہم اصلاح کو جلد سے جلد قانونی شکل دینے کی کوشش کرینگے البتہ معاشی مقاطعے کی وہ تحریک جو غالباً ہندوؤں کے غلط اقدامات کا نتیجہ ہے مسلمانوں کے لئے کسی طرح بھی مفید نہیں ہے توقع ان ذرائع کو اختیار کرنے کا ہے جو صحیح معنوں میں ہماری معاشی ترقی کا باعث ہوں۔ اس کے لئے محنت اور خاموشی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اگر مسلمان سرمایہ دار ذرا سے ایثار سے کام لیں تو ملت کی بہت سی مشکلات کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ہمارا مطلب ہے وسیع تجارتی تجاویز سے۔

جہاں تک مسجد کی واگذاری کا تعلق ہے۔ ہمارے نزدیک اس کے لئے سنجیدہ غور و فکر اور ہوشمندی کی ضرورت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جن حضرات نے اس تحریک کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی ہے وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائینگے جو مسلمانوں کے سیاسی مصالح اور ان کی آئندہ ترقی کے منافی ہو لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ مسئلہ عملی سیاسیات کا ہے اور جیسا کہ ہمنے کسی دوسری جگہ عرض کیا ہے عملی سیاسیات کی بحث طلوع اسلام کے مقاصد میں داخل نہیں ہم صرف اتنا عرض کرینگے کہ پنجاب اور پنجاب میں بالخصوص لاہور کی اسلامی جماعتوں کو ایک دوسرے کی مخالفت اور مذمت کی بجائے ــــ غیرت اور خودداری کا یہ تقاضا ہے کہ اس ہنگامے کو جلد سے جلد ختم کر دیا جائے ــــ اتحاد اور اتفاق سے کام لینا چاہیئے۔ ان کے سامنے قانون اور امن کا راستہ کھلا ہے اور اس میں کامیابی کے بہت کافی امکانات بھی ہیں۔ وہ نہایت آسانی سے یہ ظاہر کر سکتے ہیں کہ اس معاملے میں قانون کی جو تعبیر اب تک کی گئی ہے صحیح نہیں۔ علیٰ ہذا پنجاب کی رائے عامہ کو کسی ٹھیک رستے پر لگا دیا جائے تو ممکن نہیں کہ ہمارے اہل وطن اس مطالبے کو جو سراسر انصاف اور حق پسندی پر مبنی ہے تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔

آخر میں ہمیں کانگریس اور حامیان کانگریس سے ایک بات عرض کرنا ہے ــــ بُرا نہ مانیں تو ہمارے "نیشنلسٹ" مسلمان بھی انہیں میں شامل ہیں ــــ ہمارے نزدیک فرقہ وارانہ کشاکش کا سب سے بڑا سبب وہ سیاسی منافقت ہے جس میں بدقسمتی سے ہم سب مبتلا ہیں۔ یہ موقعہ اس کی تفصیل کا نہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ارباب کانگریس مسئلہ شہید گنج میں اپنے خاموش اور غیر جانبدارانہ "رویے" پر ایک مرتبہ پھر غور کریں۔ کیا ہندوستان میں "مشترکہ قومیت" کی پرورش کے لئے فرقہ وارانہ فیصلہ اور جداگانہ طریق انتخاب کی مذمت ہی سے مدد مل سکتی ہے۔ اس سلسلے میں کسی مفید اور عملی اقدام کی ضرورت نہیں؟ پنجاب کانگریس کمیٹی کو لاہور میں مقاطعے کی تحریک سے بہت دنوں کے بعد یہ کہنے کی توفیق ہوئی کہ ہندو مسلمانوں کی یہ سرگرمیاں مفاد عامہ کے لئے مضر ہیں۔ کیا اس سے پہلے جو کچھ ہوا وہ ہندوستان کے فلاح و بہبودی کیلئے مفید تھا؟ ہندو اخبارات تو اسوقت بھی دبی زبان سے کہہ رہے تھے کہ یہ سب کچھ "فرقہ وارانہ فیصلے" کا نتیجہ ہے

آثارِ ملیہ

مسجد شاہ چراغ

جو حضرات کبھی لاہور تشریف لے گئے ہیں انہیں شاید خیال ہوگا کہ عدالت عالیہ پنجاب کے شمال مغربی گوشہ کے ساتھ ساتھ مال روڈ سے کسیقدر ہٹ کر بیلو کے درختوں کا ایک جھنڈ ہے جس کے اندر سے ایک پرانا مگر خوش وضع اور متناسب گنبد نہایت شان سے نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ حضرت شاہ چراغ گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ پاس ہی دفتری ہیئت کی ایک عمارت ہے جس کے طویل و عریض اور جدید طرز کے برآمدے سیڑھیوں اور غلام گردشوں نے ایک مسجد کے در و دیوار کو چھپا رکھا ہے لیکن ڈیوڑھی سے کچھ آگے احاطے میں کھڑے ہو کر دیکھئے تو اس کے پانچوں گنبد صاف نظر آئیں گے۔ افسوس یہ ہے کہ ان متعدد روشندانوں نے جو ان گنبدوں کے بالائی حصوں پر چھتری کی طرح کھڑے ہیں ان کے حسن و خوبصورتی کو بالکل ضائع کر دیا ہے بیچ کا گنبد بڑا ہے باقی چار چھوٹے اور کسیقدر بیضاوی الشکل جن سے ایک لحظے کے لئے افغانی اسلوب تعمیر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ اہل لاہور کو معلوم ہے مال روڈ اور اس کے گرد و نواح کا یہ حصہ سکھوں کی عملداری سے پہلے نہایت بارونق اور شان و شوکت سے معمور تھا۔ پنجاب کی خوش حالی اور آب و تاب کا زمانہ اصل میں دولت مغلیہ کے استحکام سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے مسلسل سیاسی تغیرات اور فوجوں کی نقل و حرکت سے اس کی حیثیت زیادہ تر ایک "معسکر" کی رہی اکبر اور جہانگیر نے لاہور کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی اور پھر شاہ جہاں اور عالمگیر کے عہد میں تو اس کا عروج و اقبال یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ اہل ایران کے اس مشہور و معروف مقولے میں کہ "اصفہان نصف جہان" اس جملے کا اضافہ ہونے لگا "اگر لاہور نباشد"۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب کا دار السلطنت دہلی اور آگرہ کی ہمسری کرنے لگا اور اس میں ہر طرف سے بڑے بڑے مشاہیر عمائد سلطنت اور علماء و فضلا آ کر آباد ہوئے۔ اس طرح لاہور جن بزرگوں کی خاک قدم سے مشرف ہوا انکی مٹی ہوئی یادگاریں آج بھی باقی ہیں قدیم تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اس وقت عدالت عالیہ اور جنرل پوسٹ آفس کی عمارات ہیں وہاں

عہد مغلیہ میں ایک محلہ "گذر لنگر خاں" آباد تھا۔ لنگر خاں کا شمار امرائے شاہی میں ہوتا ہے جس نے بلوچستان کو چھوڑ کر لاہور میں اقامت اختیار کی

اسی زمانے میں حضرت شاہ چراغ گیلانی اچھ (بھاولپور) سے لاہور تشریف لائے معلوم ہوتا ہے لنگر خاں ان کے ارادت مندوں میں شامل تھا۔ حضرت شاہ چراغ عہد شاہجہانی میں گذرے ہیں اور ان کا پورا نام سید عبدالرزاق بن عبدالوہاب ہے۔ وہ حضرت پیر دستگیر جناب محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے ہیں ان کی پیدائش پر ان کے بزرگوں میں سے سید عبدالقادر ثالث نے فرمایا تھا کہ یہ خاندان کے چراغ ثابت ہونگے اسی لئے ان کا لقب شاہ چراغ ہوا۔ انھوں نے حج بھی کیا تھا اور صاحب تحقیقات چشتیہ کا بیان ہے کہ شاہجہاں کو ان سے خاص ارادت تھی یہانتک کہ ایک موقعہ پر شہنشاہ نے یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی صاحبزادی کو حضرت کے عقد میں دیدیں غالباً لاہور میں وہ اپنے والد شاہ محمد غوث بالا پیر کے ساتھ اقامت پذیر ہوئے ہوئے جنھوں نے یہاں رسول پورہ آباد کیا۔ آگے چلکر گذر لنگر خاں کا یہ حصہ محلہ شاہ چراغ کے نام سے موسوم ہوا۔

حضرت شاہ چراغ کا سنہ وفات ۱۰۷۸ھ (۱۶۵۷ء) ہے معلوم ہوتا ہے مفتی غلام سرور صاحب تذکرۃ العارفین نے جو تاریخ لکھی ہے غلط ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

سید گیلاں کریم ابن کریم	آن چراغ خانۂ دین و یقین
عبدرزاق است نام نامیش	بود شاہ و سید روئے زمین
بہر تاریخ وصال آں جناب	گفت سرور ۔ مرد شمس العارفین

اس سے ۱۰۸۶ کے اعداد نکلتے ہیں۔ بہر حال شاہ چراغ کا مزار عالمگیر کے حکم سے تعمیر ہوا۔ ہم نے اس مزار کو خود دیکھا ہے۔ اگرچہ اس کے بیرونی حصوں میں گچ کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا اور یوں بھی اس کی حالت نہایت خراب ہے لیکن اس کے در و دیوار پر کہیں کہیں مغلیٔ وضع کے وہ سفالے جن کی پوری آب و تاب کا اندازہ مسجد وزیر خاں ہی سے ہو سکتا ہے اب بھی موجود ہیں۔ مزار کی شرقی سمت میں والدہ خان بہادر ناظم لاہور کی قبر ہے جس کی تباہی اور بربادی کو دیکھکر مسلمانوں کی غفلت اور بے حسی پر بے اختیار ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔

یہ اس لیے کہ دولت مغلیہ کے انحطاط پر جو سیاسی اضطراب رونما ہوا اس میں پنجاب کی حفاظت اگر کسی نے کی ہے تو وہ نواب دلیر جنگ عبد الصمد خاں اور ان کا بلند نظر خاندان ہے یہ الگ بات ہے کہ پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد ہندوستان اور افغانستان میں جو حالات پیش آئے ان کی بنا پر اسلامی تہذیب اور قوت کے استحکام کی وہ کوششیں جن کی ابتدا لاہور میں ہوئی تھی یک قلم ختم ہوگئیں نواب عبد الصمد خاں اور ان کے خاندان کا تذکرہ بہت طویل ہے جس کا ذکر ہم طلوع اسلام کی کسی آئندہ اشاعت میں کریں گے (انشا ء اللہ)، مختصر یہ کہ نواب عبد الصمد خاں امرائے توران میں سے تھے اور انہیں کشمیر کی نظامت کے بعد فرخ سیر بادشاہ دہلی نے پنجاب کا ناظم مقرر کیا جہاں اس وقت سکھوں کی سرکشی انتہا پر تھی۔ نواب دلیر جنگ کی تدبیر اور اصابت رائے مسلم ہے۔ ان کی فوج کشی اور انتظامی قابلیت سے ایک دفعہ پھر اس صوبے میں امن وامان قائم ہوا۔ نواب عضد الدولہ ذکریا خاں یا نواب خان بہادر خاں اسی باپ کے لائق بیٹے تھے جو نظامت پنجاب میں ان کے جانشین ہوئے اور جن کے ۱۲ سالہ دور حکومت میں یہ سرزمین آنیوالے دور سے بے خبر عروج و ترقی کا منہ دیکھنے لگی۔ نواب شرف النسا بیگم جن کا ذکر علامہ اقبال مدظلہ نے جاوید نامہ میں کیا ہے ان کی ہمشیرہ ہیں۔ ۱۱۴۱ھ میں (عہد محمد شاہ بادشاہ) نواب ذکریا خاں نے اپنی والدہ کے زیورات سے جیسا کہ انھوں نے وصیت کی تھی وہ مسجد طیار کی جو روضۂ شاہ چراغ کے پاس واقع ہے اور جسے اس عظیم الشان خاتون کی ارادت و عقیدت کے باعث مسجد شاہ چراغ کا نام حاصل ہوا۔

مقام مسرت ہے کہ اب حکومت نے یہ مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دی ہے۔ ۱۹۳۶ء کے ابتدا ہی میں غالباً سشن جج کی عدالتیں جو اس وقت یہاں موجود ہیں کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائینگی زندہ دلان پنجاب کا فرض ہے کہ وہ مسجد کی نگہداشت اور تعمیر و ترمیم کے ساتھ نواب بیگم جان — والدہ نواب خان بہادر خاں — کے مدفن پر کوئی ایسی عمارت طیار کریں جو اس عالی مرتبت خاتون کے شایان شان ہو۔

مدیر

بین الاقوامی دنیا

حبشی الطالوی نزاع

اٹلی نے جنگ کو یا جنگ کی عوض کوئی معقول معاوضہ قبول کیا عہد جدید کے ایک زبردست

بین الاقوامی "بلیک میلنگ" میں اس کی کامیابی یقینی ہے ——— نے ونز

۱۔ **مغربی تدبر کا امتحان** ——— کرنٹ ہسٹری کی تازہ اشاعت میں مسٹر ایلن نے ونز پروفیسر تاریخ کولمبیا یونیورسٹی نے ایطالوی حبشی نزاع پر رائے زنی کرتے ہوئے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ آیا فرانس اور برطانیہ فتح حبش کے بدلے کوئی ایسی چیز پیش کرسکتے ہیں جو مسولینی کی ذاتی وجاہت اور اٹلی کے اقتدار کے شایان شان ہو۔ اس کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ مسولینی کے اقل قلیل مطالبات کیا ہیں، اہل حبش کس امر پر جنگ کرنا ضروری سمجھینگے اور فرانس اور برطانیہ کون سے علاقے بآسانی اٹلی کے سپرد کرسکتے ہیں؟ اب یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ حبش کا مسئلہ مسولینی نے خود چھیڑا تھا۔ اہل اٹلی کو شروع شروع میں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ بعض ذمہ دار لوگوں نے اس کی مخالفت بھی کی۔ علی ھذا یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مسولینی کا اصل ارادہ کیا ہے۔ وسیع معاشی مراعات اور ان کے لئے حبش کے بعض حصوں کا الحاق، پوری ریاست پر اٹلی کی سیادت یا مکمل فتح۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مسولینی کی خواہش مکمل فتح کی ہے کیونکہ (بقول مسولینی) "جس وقت یورپ نے اپنے تہذیبی مقصد کو خیرباد کردیا اس کا خاتمہ یقینی ہے۔" چنانچہ ماہ جولائی سے لیکر شروع اگست تک مسولینی نے تمام اٹلی میں اس تہذیبی مہم کا جوش و خروش پیدا کردیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایطالوی اخبارات نے برطانیہ، جاپان، اور حبش کے خلاف طرح طرح کے ناجائز اور بے بنیاد الزامات قائم کرنا شروع کردیے۔ برطانیہ عظمیٰ سے اہل ایطالیہ بالخصوص خفا ہیں ان کی رائے میں برطانوی مخالفت کا راز یہ ہے کہ جھیل تانہ اور نیل ازرق کے منبع برطانیہ کے قبضہ میں آجائیں

بہرکیف اٹلی کے اطمینان کے لئے معمولی مراعات کافی نہیں ہونگی۔ یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ مسولینی کو جس چیز نے جنگ پر آمادہ کیا وہ اٹلی کی معاشی ابتری اور اس کا پیدا کردہ سیاسی اضطراب تھا۔ مسولینی کا اقتدار اب یونہیں قائم رہ سکتا ہے کہ اپنے اہل ملک کے لئے کوئی زبردست فائدہ حاصل کرے۔ خیال یہ ہے کہ اٹلی کی زائد آبادی کو کم کرنے کے لئے تیس لاکھ اطالوی حبش کے بلند میدانوں میں آباد کئے جاسکینگے۔

مزید برآں یہ امر بھی غورطلب ہے کہ اٹلی کو شروع ہی سے اس امر کی شکایت تھی کہ جنگ عظیم کے "مال غنیمت" کی تقسیم میں اس کے ساتھ ناانصافی برتی گئی۔ ۱۹۱۵ء میں اس نے وسیع نوآبادیات کا خواب دیکھنا شروع کردیا تھا۔ اٹلی کو اپنی صنعت و حرفت کے لئے اجناس خام کی ضرورت تھی اور مسولینی حصول طاقت سے بہت پہلے بہ حیثیت اخبار نویس ۱۹۱۷ء ہی میں اضافہ مقبوضات پر زور دے رہا تھا۔ برقہ، ارتیریا اور بلا دسومال بنجر اور ریگستانی علاقے ہیں۔ لہذا اٹلی کی نظر قدرتاً حبش کی "معتدل اور زرخیز وادیوں" پر ہے۔ مسولینی جنگ کرنے پر آمادہ ہے اور اگر کوئی خطرہ اس کی راہ میں حائل ہوسکتا ہے تو صرف مالی دقتیں یا ایک طویل خونریزی کا ڈر۔ اٹلی کی ملی حالت مدت سے خراب ہے اور اگر بالفرض اسے جنگ میں کامیابی ہوئی تب بھی "حبش کی زرخیز وادیوں سے حصول زر کے لئے بیحد سرمایہ کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت غیر جانبدار حکومتوں نے مصارف جنگ کا تخمینہ دس ارب لیرا کیا ہے۔ لیکن جنگی تخمینے ہمیشہ بے کار ہوتے ہیں۔ اٹلی کو جنگ کے لئے روپیہ ملنا چاہئے۔ کامیابی ہوئی تو حبش کی معاشی ترقی کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ہوجائیگا۔ جہانتک جنگی تیاریوں کا تعلق ہے معلوم ہوتا ہے مسولینی محض اظہار قوت سے بازی جیتنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں اہل حبش کی بلند ہمتی قابل داد ہے۔ ۱۸ جولائی کو نجاشی نے پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ موت کو غلامی پر ترجیح دیتا ہے۔ عام بھرتی یکم اگست سے شروع ہے۔ سرحدوں کے تمام اہم مقامات کا استحکام بالخصوص شمال میں یورپین افسروں کے ماتحت جاری ہے۔ عساکر خفیہ طور پر حرکت کر رہے ہیں اور شہنشاہ حبش نے ایک نہیں کئی مرتبہ اس امر کی سخت شکایت کی ہے کہ مغربی طاقتوں کا اسلحہ کی بہم رسانی سے انکار کردینا سراسر ناانصافی ہے۔ جبوتی کی فرانسیسی ریلوے سے اسلحہ کی ترسیل روک دی گئی ہے۔ بلجیم اور زکوسلاکیا

نے باقیماندہ ٹھیکے منسوخ کردیے ہیں۔ یہانتک کہ برطانوی حکومت نے بھی اسلحہ کی خرید بند کردی۔ بایں ہمہ اہل حبش کے عزم میں کوئی فرق نہیں آیا البتہ حبش کی آزادی کو قائم رکھتے ہوئے نجاشی اس امر کے لئے تیار ہے کہ اٹلی کو ہر قسم کی مراعات دیدی جائیں بلکہ بعض علاقوں کا تبادلہ بھی ممکن ہے مثلاً صوبہ اوگادن کا جو ایطالوی سومالستان کے متصل واقع ہے لیکن یہ امر کہ اہل اطالیہ ارتیریا سے ایطالوی سومالستان کو حبش میں سے ریل لیجائیں کسی طرح گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کے ایک سرے سے لیکر دوسرے تک تمام حبشی اور اسلامی آبادیاں اٹلی کے مظالم اور حرص و آز کے خلاف احتجاج کررہی ہیں۔ مصر، ترکی، اسلامی افریقہ، شرق اردن، افریقہ کی زولو اور تمام "غیر سفید" آبادیوں علیٰ ہذا ہندوستان اور ہندچینی کی ہمدردی حبش کے ساتھ ہے۔ چنانچہ یکم اگست کو پریذیڈنٹ روزولٹ نے نیگرو جذبات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا تھا کہ لیگ کو صلح کا کوئی موثر ذریعہ تلاش کرنا چاہیے۔ اسی دن سر سموئل ہور نے جو تقریر کی اس کا ماحصل یہ تھا کہ حبش کی لڑائی غیر ضروری اور ناجائز بلکہ مجرمانہ ہوگی۔ لیکن سر سموئل کے ذہن میں اس وقت محض اٹلی نہیں بلکہ فرانس کی نوآبادیات بھی تھیں۔ بایں ہمہ ۳۰ جولائی کو جنیوا میں انجمن اقوام کا جو اجلاس شروع ہوا۔ اس سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوسکا اٹلی نے ولول کے متعلق شہادت طلب کرنے سے انکار کردیا۔ کیونکہ ولول سرحد سے ۶۰ میل دور واقع ہے اور قانون یہ کہتا ہے کہ اطالیہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ پھر فرانس، اٹلی اور برطانیہ کے درمیان متفقہ عمل کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ فرانس کا رجحان اٹلی کی طرف تھا ممکن ہے موسیو لاول گذشتہ سرما میں جرمنی کے مقابلے پر اٹلی کی حمایت کے عوض یہ وعدہ کرچکے ہوں کہ وہ حبش کے معاملے میں اس کی تائید کرینگے۔ البتہ اس اجلاس میں اٹلی کا یہ کہنا بہت ٹھیک تھا کہ افریقی انتدابات کے مسئلے پر نظر ثانی کی جائے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو مشرقی افریقہ پر جرمنی کے حقوق کا سوال پیدا ہوجاتا - لہذا آخر کار یہ فیصلہ کیا گیا کہ ولول کے معاملے میں انجمن اپنا فیصلہ صادر کرے اور اگر یہ فیصلہ فریقین کو مطمئن نہ کرسکے تو چار ستمبر کو انجمن کا ایک اور اجلاس منعقد ہو۔ بہرکیف آئندہ جو کچھ بھی ہو یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر برطانوی بیڑہ مالٹا سے بڑھکر سوئیز میں آجائے تو اٹلی کی ساری چیخ و پکار ختم ہوسکتی ہے لیکن انگریز یہ پسند نہیں کرینگے کہ اپنے سابق اتحادی کا

رُخ جرمنی کی طرف موڑ دیں لہٰذا مسولینی مطمئن ہے اور اس کی شر انگیزیاں جاری ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ فرانس، برطانیہ، روس اور ریاستہائے متحدہ جنھوں نے جنگ کے بعد تمام مال غنیمت کو آپس میں تقسیم کرلیا تھا جاپان اٹلی اور جرمنی پرے دے کر رہے ہیں لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اٹلی کا دہان آزاپنے مقبوضات ہی سے پر کریں۔

۴۔ انجمن اقوام کا اجلاس ــــ شروع ستمبر میں انجمن اقوام کا اجلاس جینوا میں منعقد ہوا یہ امر پہلے ہی سے معلوم ہوگیا تھا کہ اگرچہ اطالوی حبشی کمیشن نے ولول کی ذمہ داری کسی حکومت پر عائد نہیں کی لیکن موسیو پولی تیس "پانچویں پیچ" کی رائے یہ ہے کہ اس حادثے کا جرم حبش پر عائد ہوتا ہے۔ بہرکیف انجمن کی کارروائی شروع ہوئی۔ گفتگو ئے پیرس کا حوالہ دیا گیا اور اٹلی کے اطمینان کے لئے مختلف تجاویز پیش ہونے لگیں۔ معاشی نگرانی کا حق ؟ حبش میں ایک برطانوی ایطالوی جنڈار کا تعین اور اٹلی کا ہوائی اسٹیشن اور فوجی چوکیاں قائم کرنا ؟ مگر ایطالوی ارباب لبست وکشاد کسی بات پر رضامند نہ ہوئے۔ بیرن الواسی کا رویہ نہایت درجہ غیر مصالحانہ تھا۔ حکومت اٹلی نے حبش کے خلاف ایک طویل فرد جرم طیار کر رکھی تھی۔ ولول اور حرار کے سوا تمام ایطالوی قنصل واپس بلالئے گئے اور اریتریا اور سومالستان میں جنگی نقل وحرکت شروع ہوگئی۔ اب انتظار اس امر کا تھا کہ انجمن کی جماعت خمسہ جس کے ذمہ اس قضئے کا تصفیہ کیا گیا تھا کیا فیصلہ کرتی ہے۔ برطانیہ اور فرانس بہرکیف متفق الرائے تھے موسیو لاول پر مسولینی کو بہت بھروسا تھا لیکن انھوں نے علی الاعلان برطانوی حکمت عملی کا ساتھ دیا اور روس نے اس کی تائید کی شروع میں تو اہل اٹلی بہت جز بز ہوئے لیکن آخرالامر مسولینی نے انگلستان اور اٹلی کے عہد مودت پر زور دینا شروع کیا جماعت خمسہ کا فیصلہ بہرحال اسے پسند نہیں۔ برطانوی اور فرانسیسی سومالستان یا اس کے متصل حبش کے بنجر اور صحرائی اقطاع کو لیکر اہل اٹلی کیا کرینگے۔ انہیں ریگستانوں کی ضرورت نہیں ایطالوی کابینے کے اس رویے پر ہر وقت جنگ کا خطرہ ہے۔ لیکن فرانس کے سیاسی حلقوں میں رائے یہ ہے کہ گو صلح کا دروازہ بند ہو چکا ہے مگر ابھی سنگی لگنا باقی ہے۔ اور بات ہے بھی ٹھیک اس لئے کہ آخری اطلاع کے مطابق حکومت اٹلی اب بھی گفت وشنید پر آمادہ ہے۔ لہٰذا مسولینی سے اس کے آخری مطالبات دریافت کئے جائینگے۔ اور حبش؟ حبش برائے نام آزادی کے سوا ہر چیز کو خیرباد کہنے پر آمادہ ہے۔ بین الاقوامی دنیا کا سب شور وغوغا صرف مغربی ڈپلومیسی کا ایک کھیل ہے مدیر

جاپان کا بڑھتا ہوا تغلب

۱۔ جاپان اور چین ـــــ اگرچہ حکومت نانکن شمالی چین کے متعلق تمام جاپانی مطالبات کو منظور کر چکی ہے لیکن جاپان کو شکایت ہے کہ چین کے شمالی اور دوسرے حصوں میں ابھی تک خفیہ مجلسیں قائم ہیں۔ اس حالت میں صحیح اور حقیقی صلح کا امکان نہیں۔ جاپان کا مطالبہ یہ ہے کہ چیانگ (شمالی چین کا ہزیمت خوردہ سپہ سالار) کو یا تو علی الاعلان ہم سے لڑنا چاہئے یا صلح کر لینی چاہئے۔ دونوں صورتوں میں ضروری ہے کہ وہ حکومت کی ذمہ داری قبول کرے ورنہ جاپان مزید کارروائی کے لئے مجبور ہو جائیگا اور یہ ظاہر ہے کہ جاپان جو کچھ کہتا ہے اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ شمالی چین کے غیر حربی علاقے پر جس میں صوبہ چاہار کا زائد حصہ شامل ہے اس کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا ہے پیکن اور تن طسن بھی عملاً اُس کے تصرف میں ہیں۔ اب یہ دعوی کیا گیا ہے کہ تانگ کو میں جو معاہدہ ہوا تھا اُس کی رو سے جاپان کو حق حاصل کہ وہ چین میں تار، ریل، ریڈیو، پرواز اور دوسرے ذرائع رسل و رسائل

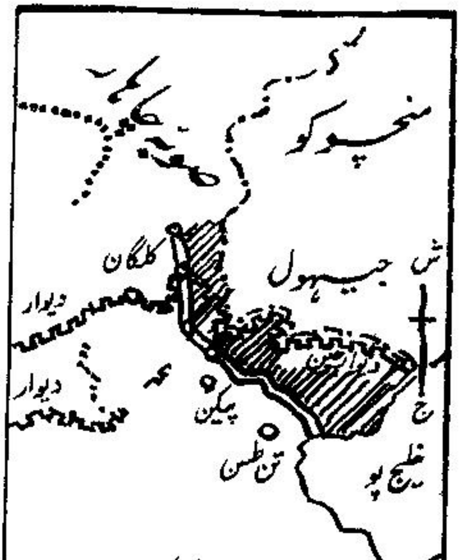

کو ترقی دے (حکومت نانکن کو اس قسم کے معاہدے سے انکار ہے) بہرحال منچوکو، پیکن اور تن طسن کے درمیان براہ جیہول باقاعدہ پرواز کی تجاویز کی جا رہی ہیں۔ پیکن میں اس وقت جاپانی تاجروں کا زور ہے اور شمالی چین کی ترقی کے لئے ایک زبردست جمعیت کی تاسیس زیر بحث۔

۲۔ روسی جاپانی آویزش ـــــ جب سے روس نے چینی شرقی ریلوے میں اپنے مصالح کو منچوکو کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا جاپان اور چین کی باہمی کشمکش کچھ دنوں کیلئے دور ہو گئی تھی اب پھر وہی دفتر شکایات اور ایک

دوسرے کے خلاف "معاندانہ اقدام" کا قصہ چھڑ گیا ہے۔ روس کو گلہ ہے کہ دریائے امور اور اسوری کے سنگم پر دو مرتبہ منچوکوی افواج روسی علاقے میں داخل ہوگئیں اور دریائے امور کے روسی حصے میں منچوکوی مسلح کشتیاں گشت کرتی ہیں۔ لہٰذا روسی سرحدوں پر جاپانی منچوکوی افواج کی یہ دست درازی کسی طرح گوارا نہیں کی جاسکتی۔ اس کی ذمہ داری جاپان کے سر ہوگی۔ اس تہدید کا جواب دوسرے فریق نے جن الفاظ میں دیا ہے وہ نہایت سخت ہیں جاپانی وزیر خارجہ نے کہا کہ روس کے تمام الزامات بے بنیاد ہیں اور اس کا مطلب مبالغہ آمیز اطلاعوں سے عوام میں جوش پیدا کرنا ہے۔ جاپانیوں نے کبھی سرحدوں کو عبور نہیں کیا۔ رہا امور کا مسئلہ سو یہ ایک سرحدی دریا ہے جس میں دونوں حکومتوں کا حق برابر ہے۔ جاپان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ امور اور اسوری کے سنگم میں جو جزائر واقع ہیں وہ دراصل اس کی ملکیت ہیں آخر جون میں منچوکو کے دورے کے بعد وزیر خارجہ نے نیشنل پالیسی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ روس نے مشرقی سرحدوں پر دو لاکھ سپاہی تعینات کر رکھے ہیں۔ جاپان کی رائے یہ ہے کہ ان سرحدوں سے فوجی استحکامات اٹھالینا چاہیے۔ لیکن اس سے روسی لب و لہجے کی درشتی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سوویٹ وزیر اعظم کا خیال ہے کہ جاپانی جنگجو مشرقی اقصے میں کوئی نہ کوئی تصادم پیدا کرنا چاہتے ہیں اور روسی اخبارات کی رائے ہے کہ جاپان کی طرف سے یہ سب عذر مزید علاقوں کے تصرف کیلئے پیدا کیے جا رہے ہیں۔ اسی زمانے میں ایک ناگوار واقعہ پیش آیا۔ ایک جاپانی افسر کو جو پیمائش میں مصروف تھا۔ منگولوی حکومت نے گرفتار کر لیا۔ اس پر منگولیا کے مصالحانہ رویے کے باوجود جاپانی منچوکوی حکومت نے مطالبہ کیا کہ بیرون منگولیا میں مستقلاً منچوکو کے فوجی نمائندے موجود رہنا چاہیئے۔ روس نے اس کی مخالفت کی کہ اس کا مطلب منگولیا کی نگرانی کرنا ہے تاکہ جاپان کو جنگی کاروائیوں میں سہولت ہو۔ لہٰذا اس مطالبے کو رد کر دیا گیا۔ اب چاہار اور پیکن تو طسن کے علاقے میں جاپانی سیادت قائم ہے۔ گویا جاپان کو جنوب سے کوئی خطرہ نہیں۔ بالفاظ دیگر یورال تک تمام سائبیریا جاپانی حملوں کی زد میں ہے۔ روس اس صورت حالات کا نہایت احتیاط سے مطالعہ کر رہا ہے۔

سیاسیات ہند

اسمبلی کا اجلاس شملہ

۱۔ کرمنل لا امنڈمنٹ بل —— ۲ ستمبر کو لیجسلیٹو اسمبلی کا مختصر سا اجلاس شروع ہوا۔ سرکاری اور غیر سرکاری مسودہ ہائے قانون کے علاوہ التوا کی متعدد تحریکیں پیش ہونے والی تھیں لیکن ان میں سے بعض کو مصلحتاً روک دیا گیا۔ لہٰذا اسمبلی میں سب سے زیادہ اہم بحث کرمنل لا امینڈمنٹ بل پر ہوئی۔ حکومت یہ چاہتی تھی کہ اس عارضی قانون کو جسے قانون شکنی کے زمانے میں امن عامہ کی خاطر وضع کیا گیا تھا منظوری اسمبلی مستقل شکل دیدی جائے کیونکہ حکومت کے نزدیک ملک میں بدستور اس کی ضرورت ہے اور اس کا مقصد بقول ہوم ممبر صرف دہشت انگیزی اور امن سوز حرکات کا سدباب کرنا ہے۔ چنانچہ اسمبلی کی پہلی ہی نشست میں سر ہنری کریک نے اس قانون کا مسودہ پیش کر دیا اور پھر ۵ ستمبر کو اس پر تقریر کرتے ہوئے ایوان کی توجہ بعض غیر قانونی سرگرمیوں کے علاوہ بالخصوص کمیونسٹ پارٹی کی طرف منعطف کرائی جس کے مقاصد میں کانگریس کی مخالفت بھی شامل ہے۔ جیسا کہ سب کو معلوم تھا سوراج پارٹی نے حکومت کے نقطہ نظر سے اتفاق نہیں کیا۔ مسٹر ستیا مورتی کی طرف سے اسکی ابتدا ہوئی۔ مخالفت کی طرف سے جتنی تقریریں ہوئیں ان کا مفاد یہ تھا کہ حکومت کو جن امور کی شکایت ہے ان کے انسداد کے لئے ملک کا عام قانون کافی ہے۔ مسٹر ڈیسائی نے کہا "دہشت انگیزی کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان اسباب کو دور کیا جائے جو اس کے محرک ہیں"۔ ان کی رائے میں پکٹنگ کو محض اس لئے روکا جاتا ہے کہ دیسی مصنوعات کو ترقی نہ ہو۔ دوران مخالفت میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگرچہ اسوقت ہم نے قانون شکنی کی تحریک کو سچے دل سے ترک کر رکھا ہے لیکن اس قسم کے قوانین کی تشکیل سے شبہ ہے کہ شاید لوگ پھر اس کی طرف مائل ہو جائیں۔ مسٹر عبدالمتین چودھری کو شکایت تھی کہ اخبارات کے لئے اس قانون کی موجودگی نہایت ضرر رساں ہے پچھلے پانچ برس میں اکتالیس اسلامی اخبار بند ہو چکے ہیں اور اگر

مسلمان اراکین نے حکومت کا ساتھ دیا تو اسلامی سحافت کو جو نقصان پہنچیگا اسکی ذمہ داری انپر ہوگی (اسٹیٹسمین ۱۳ ستمبر)
بہرکیف ایوان نے ایک طویل بحث کے بعد جس میں تمام جماعتیں شامل تھیں ہوم ممبر کی تحریک کو دس کی اکثریت
سے مسترد کر دیا مسلم اراکین نے بھی زیادہ تر مخالفت ہی کا ساتھ دیا. ملک کے غیر سرکاری حلقوں میں اس کارروائی
پر علی العموم اظہار اطمینان کیا جا رہا ہے. کانگریس اپنی کامیابی پر مسرور ہے کیونکہ رائے عامہ کے نزدیک یہ ایک
اخلاقی فتح ہے. لیکن یہاں حکومت کا نقطہ نظر سمجھ لینا بھی ضروری ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ بدامنی اور دہشت
انگیزی کی تحریکات کو روکنے کے لئے عام قانون ناکافی ہے. لہذا اگر اس قانون سے کسی کو تکلیف پہنچ سکتی ہے
تو صرف ان لوگوں کو جن کی سرگرمیاں قانون اور امن کے منافی ہیں. جریدۂ اسٹیٹسمین کی رائے ہے کہ اس وقت
ملک کی فرقہ وارانہ فضا نہایت مکدر ہے اور گو انقلابی تحریک دب گئی ہے لیکن اس کے از سر نو زندہ ہونے کا
ہر وقت خطرہ ہے اس لئے ضروری ہے کہ حکومت کے پاس اپنی حفاظت کے لئے کوئی حربہ موجود رہے.
مخالفت کا یہ کہنا کہ چونکہ (آئندہ دستور میں) قانون اور امن کے شعبوں کو (صوبوں کی طرف) منتقل کر دیا جائیگا
لہذا مرکز کو ضرورت نہیں کہ وہ اس ضمن میں کوئی خاص قانون وضع کرے صحیح نہیں اس لئے کہ ان امور
میں جو ریاست کے تحفظ کے لئے ناگزیر ہیں اتحاد عمل کا ہونا لازمی ہے (اسٹیٹسمین ۸ ستمبر) "رہے اخبارات سو
اگر وہ اپنا لب ولہجہ ٹھیک رکھیں تو ان سے کوئی باز پرس نہیں کرے گا. انکو جائز حدود سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے
یہ ہے لب لباب اس مخالفت اور موافقت کا جو کرمنل لا امینڈمنٹ بل کے متعلق ہوتی رہی.

۲. ہز ایکسیلنسی والسرائے کی تقریر ـــ ۸ ستمبر کو ہز ایکسیلنسی والسرائے نے اسمبلی اور ایوان بالا کے متفقہ
اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے ہندوستان کے آئندہ دستور پر خاص طور سے زور دیا. ہز ایکسیلنسی نے
کہا کہ یہ پہلا موقعہ ہے جب ہندوستان ایک عظیم الشان ملک کی حیثیت اختیار کرے گا. یہ ایک نیک فال ہے کہ
ہندوستان نے انتہائی ترقی یافتہ نو آبادیات کے راستے پر چلنا شروع کر دیا ہے جس کے ابتدائی مرحلوں کو
طے کرنا حصول مقصد کے لئے ضروری تھا. ہز ایکسیلنسی نے فرقہ دارانہ کشاکش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
اراکین مجلس کی توجہ ایک دفعہ پھر تقریر الہ آباد کی طرف منعطف کرائی اور جب انھوں نے ہندوستان کی
تمناؤں سے مسلسل اور دوامی ہمدردی کا اعلان کیا تو ایوان نعرہ ہائے تحسین اور خوشی کی تالیوں سے گونج اٹھا.

ہزایکسیلنسی نے اس امر پرخاص طور سے اطمینان کا اظہار کیا کہ ان کے عہد حکومت میں یہ دیرینہ تمنا پوری ہوئی کہ ہندوستان اپنے مشترکہ مفاد کے لئے ایک ہی حکومت کے ماتحت ہو۔ اس سلسلہ میں ہزایکسیلنسی نے ہندوستانیوں کو باہمی اتحاد و اتفاق اور آئندہ دستور کی مخالفت اور مزاحمت کی بجائے آئینی ذرائع کے استعمال اور اشتراک عمل کی دعوت دی۔

۳۔ سوراج پارٹی اور اسمبلی — اس فت سوراج پارٹی کی تمامتر توجہ حکومت کی مخالفت پر ہے اور اس میں متعدد بار کامیابی بھی ہو چکی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس تخریبی روش کے علاوہ کیا اس جماعت کا اسمبلی کے اندر کوئی تعمیری خدمت انجام دینا ممکن نہیں؟ ہم نہیں کہہ سکتے اس بات کا سوراج پارٹی کے پاس کیا جواب ہے جریدہ اسٹیٹسمین کو شکایت ہے کہ یہ جماعت ہمیشہ حکومت کو اس امر کا طعنہ دیا کرتی ہے کہ وہ اہل ہند کے فلاح و بہبودی کے لئے کچھ نہیں کرتی لیکن سوال یہ ہے کہ اس بارے میں خود اس کا طرز عمل کہاں تک حق بجانب ہے۔ ملک میں سینکڑوں مسائل ایسے ہیں جو مذہب اور سیاسیات کی حدود سے آزاد ہیں ان کے لئے سوراج پارٹی بہت کچھ کر سکتی ہے۔ کیا اقوام ہند کے اتحاد کا مسئلہ غور و فکر اور کسی عملی اقدام کا محتاج نہیں۔ لاہور میں ایک مسجد گرادی گئی۔ کیا اس جماعت نے کوئی ایسا مسودہ قانون پیش کیا جس کے ماتحت کسی معبد کا گرانا اس وقت تک ناجائز ٹھیرایا جائے جب تک کہ وہ استعمال میں آسکے (اسٹیٹسمین یکم ستمبر) جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ سوراج پاٹی کے پاس ان باتوں کا کیا جواب ہے لیکن یہ مسئلہ واقعی غور طلب ہے کہ محض تحریکات التوا، اعتراض، نکتہ چینی اور مخالفانہ کارروائیاں ہی ہندوستان کی آئینی ترقی کیلئے ضروری ہیں یا مجالس کے اندر رہ کر کوئی مفید کام بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے یہ سوال اس لئے اُٹھایا ہے کہ سوراج پارٹی۔ یعنی کانگریس۔ کو ہندوستان کی نمائندگی کا دعویٰ ہے اور اب اس میں عہدوں کی قبولیت اور عدم قبولیت کی بحث جاری ہے۔ اندریں حالات کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ سوراج پارٹی اپنے رویے کا از سر نو جائزہ لے کر کسی مفید اور مناسب نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرے

۴۔ لطائف — جیسا کہ بالعموم قاعدہ ہے اس دفعہ بھی اسمبلی کی بحثیں اراکین کی باہمی چھیڑ چھاڑ اور لطائف سے خالی نہیں رہیں۔ ایک نو جبش ہی میں افواج بھیجنے کے مسئلہ پر مولانا شوکت علی نے فرمایا

کہ وہ کمزوروں کی امداد میں خود بھی بھرتی ہونے کے لئے طیار رہیں — مولانا کی جواں ہمتی مسلم ہے — اور پھر کرمنل لا امنیڈمنٹ بل کی مخالفت کرتے ہوئے یہ عجیب و غریب رائے ظاہر کی کہ اگر آئی۔سی۔ایس کے تمام ممبروں کو ملازمت سے پہلے کچھ دنوں جیل میں رکھا جائے تو بہت بہتر ہوگا۔ اس پر تمام ایوان قہقہوں سے گونج اٹھا۔

اسی بحث کے دوران میں جب مسٹر ایف۔ای۔ جیمز یہ کہکر انگلستان کی تعریف کر رہے تھے کہ وہ ایک حریت پسند ملک ہے تو کسی ممبر نے ان کی توجہ امریکہ اور آئرلینڈ کی طرف منعطف کرائی۔ اس پر خدا معلوم مسٹر جیمز کے منہ سے کیوں کر یہ الفاظ نکل گئے کہ "پھر آپ کس کے ماتحت رہنا چاہتے ہیں — اٹلی کے؟"

وہی آواز — "اپنے آپ کے"

مسٹر آینگر نے وی نڈ گولڈ ڈویلپمنٹ کمپنی لمیٹڈ کے متعلق بعض سوالات پوچھتے ہوئے کہا تھا کہ اگر اس کمپنی کو فائدے کی امید نہیں تو اس کو قائم کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اسکا جواب مسٹر مچل نے یہ دیا "آنریبل ممبر کو معلوم ہونا چاہئے کہ انسان کے دل میں ہمیشہ امید موجزن رہتی ہے۔ انسان نے جو دولت سونے کی تمنا اس کے حصول میں صرف کی ہے۔ وہ سونے کی کانوں سے بھی برآمد نہیں ہوئی۔"

فلموں کی نگرانی کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے جس میں "بوسہ بازی کا پریشان کن مبحث" بھی آگیا تھا مسٹر سری پرکاش نے ایوان کو بتلایا کہ ہندوستان میں ۹۰ فی صدی خاوند اپنی بیویوں کا منہ نہیں چومتے!

کانگریس کی ذمہ داریاں

امرت بازار پتر کا کی اشاعت خاص میں بابو سباش چندر بوس کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے ان مختلف رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے جو اس وقت کانگریس میں سرگرم کار ہیں اس امر پر بحث کی ہے کہ کانگریس کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ ان کے نزدیک فرقہ دارانہ فیصلے کا نام نہاد مسئلہ اور عہدوں کی قبولیت کا سوال کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کانگریس میں سب سے زیادہ اہمیت سوشلسٹ جماعت کو ہے جس

کی طاقت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اول یہ دیکھ لینا چاہئے کہ ارباب کانگریس میں کن باتوں پر اختلاف ہے اول تو کامل آزادی یا درجہ نوآبادیات کا سوال ہے پھر یہ بحث کہ حصول استقلال کے بعد ہندوستان میں جو حکومت قائم ہوگی اُس کی نوعیت کیا ہونی چاہئے۔ اور تیسرے یہ امر کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوں تو کیونکر ۱۹۲۳ ۱۹۲۰ء میں زیادہ تر توجہ اسی آخری مسئلے پر تھی لیکن اب ۱۹۲۹ء کے بعد پہلے دو سوالات پیش نظر ہیں اور اگر کانگریس ان کو حل نہ کر سکی تو اس میں مزید افتراق کا خدشہ ہے۔ ناممکن ہے کہ اس حالت میں کانگریس ایک وطنی جمعیت ہونے دعویٰ کر سکے۔

سباش بابو کہتے ہیں کہ دنیا میں کامیابی کے لئے ایک چیز شرط ہے اور وہ یہ کہ جو بھی سیاسی جماعت ہو ایک فریق کے ہاتھ میں ہو۔ یہی ترکی میں ہوا اور یہی اٹلی اور جرمنی میں جیسا کہ فسطائیت اور ہٹلریت سے ظاہر ہے کانگریس نے ٹریڈ یونین کانگریس، کسان سبھا اور ریاستی باشندوں کی کانفرنس کو اپنے حلقے سے خارج کر رکھا ہے۔ یوں جس کانگریس کو دیکھنے اتحاد و اتفاق کے لئے بیتاب نظر آئیگا۔ لیکن یہ امر کہ وہ نفاق و اختلاف کے اسباب کو رفع کرے اس سے انہیں کوئی تعلق نہیں۔ گذشتہ سال کانگریس کا جو دستور از سر نو مرتب ہوا ہے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ رجعت پسندانہ اور غیر جمہوری ہے۔ سباش بابو کی رائے ہے کہ (۱) کانگریس کا موجودہ دستور بدل دیا جائے اور (۲) اسے ایک ہی جماعت کے زیر اختیار رہنا چاہئے تاکہ وہ تمام قوتیں جو نظام شہنشاہیت کی مخالف ہیں ایک مرکز پر جمع ہو سکیں۔ انھوں نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ کیا "لیفٹسٹ پارٹی" اس فریضے کو سرانجام دینے کی کوشش کریگی؟ بحوالہ ہندوستان ٹائمز ۲۲ ستمبر

ہم اپنے مخصوص نقطہ نظر کے ماتحت گو سباش بابو کی تجاویز اور ان کے خیالات سے اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن اصولاً ہمیں ان کی رائے سے اتفاق ہے کانگریس اپنے کسی دعویٰ میں بھی حق بجانب نہیں۔ اس کو وطنی جماعت ٹھیرانا غلطی ہے اور یہ امر کہ وہ آزادی ہند کی طلبگار ہے اور بھی غلط اس کی روش اس کے خیالات اور اس کی قیادت غرضیکہ ہر فعل میں ایک طرح کا تذبذب، دو رُخی، سطحیت اور تصنع کا زور ہے۔ یہ اس لئے کہ ہندوستان کی رائے عامہ ابھی پست ہے اور اس کے تمام عناصر بیدار نہیں ہوئے بہرکیف اگر کانگریس صحیح معنوں میں ملک کی کوئی خدمت کرنا چاہتی ہے تو اسکیلئے کسی ایک اصول کا فیصلہ کر لینا ضروری ہے

سیاسیات پنجاب

جریدہ اسٹیٹسمین کے خاص نامہ نگار نے پنجاب کی مختلف سیاسی جماعتوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا

———— "اُس وقت پنجاب میں سات جماعتیں ہیں تین مسلمانوں میں — دیہاتی، مجاہد اور احرار — تین ہندوؤں میں — دیہاتی، ہندو سبھا اور کانگریس - اور ایک جماعت سکھوں کی یعنی اکالی۔ اب تک ہندو اور مسلم دیہاتی ملکر کام کرتے رہے ہیں، مگر دیہاتی جماعت کونسل کے باہر کوئی اہمیت یا اثر نہیں رکھتی۔ اس کی بنا میاں سر فضل حسین نے رکھی تھی اور اب چودھری چھوٹو رام اس کے رہنما ہیں، عوام کو اگرچہ اس جماعت کے پروگرام کا مطلق علم نہیں لیکن دیہاتیوں کی نمائندہ جماعت کی حیثیت میں اس کی نظر مالگذاری اور آبیانے پر ہو سکتی ہے یا دیہاتی قرضوں کے مسئلے پر جس کے متعلق ایک دو قانون منظور ہو چکے ہیں یعنی قانون حسابات ساہوکاراں اور قانون تخفیف قرضہ جات۔ اب یہ کوشش ہے کہ مقروض قید اور انکی جائداد (مکان اور زرعی املاک) قرقی سے محفوظ رہے اور حصول قرضہ کی مدت بھی کم کردی جائے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ پنجاب کے دیہاتی قرضے کی مقدار دو ارب روپیہ ہے! لہذا یونینسٹ پارٹی (کونسل کی زمیندار جماعت) کو دیکھنا ہوگا کہ وہ اس کے متعلق کیا تجاویز اختیار کرسکتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آبپاشی میں سہولتوں کے لئے جنوبی، مغربی اور وسطی پنجاب میں نہروں کا جو سلسلہ زیر غور ہے یہ جماعت انکی تعمیر پر زور دے بشرطیکہ صوبہ سندھ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔ دیہاتیوں کے لئے زیادہ ملازمتوں کے حصول پر یہ لوگ طبعاً اصرار کرینگے اور چونکہ مالگذاری میں تخفیف کی وجہ سے صوبے کے مالیات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو لہذا اسکی تجویز یہ ہوگی کہ غیر زرعی آبادی پر مزید ٹیکس عائد کئے جائیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہندو سبھا کا رد یہ کونسل میں کیا ہوگا۔ یہ جماعت ۱۹۰۰ء میں قانون عدم استرداد اراضیات کے خلاف قائم ہوئی تھی جس کے ماتحت بہت کم ہندو قبائل اور جاتیاں اراضی خریدنے کا حق رکھتی ہیں گو یہ قانون منسوخ نہیں ہو سکتا لیکن مہاسبھا فرقہ دارانہ فیصلہ کیسا تھا اس کی بھی مخالفت کریگی۔ اس کو اس بات پر بھی اعتراض ہوگا کہ غیر زرعی آبادی پر زیادہ ٹیکس نہیں لگیں لیکن تخفیف مالگذاری اور شرح آبیانہ کے ساتھ جب تک وہ آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں بتلائینگے

احرار اور اکالی ان کی مخالفت پر مجبور ہونگے۔ رہے کانگریسی سو ان کی روش ہوگی کہ کونسل کے کام میں رکاوٹ پیدا کریں۔ ان کے لئے اکثریت حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ان کے سامنے کوئی تعمیری پروگرام ہو اور اس میں بھی دیہات کی اصلاح و ترقی ملحوظ ہے۔ اکالیوں کے متعلق یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ حالات کے ماتحت مہاسبھا اور کانگریس سے مل کر حکومت کی مخالفت کرتے ہیں یا زمینداروں کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان کے سامنے بھی فرقہ وارانہ فیصلہ کی تنسیخ کے سوا اور کوئی پروگرام نہیں البتہ احرار اور مجاہدین ملکر کام کرینگے۔ مگر ان کی توجہ صرف ملی معاملات پر ہوگی۔ قضیہ شہید گنج نے یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ اوقاف مساجد مقابر اور دوسرے مذہبی مقامات کے تحفظ کے لئے ایک قانون بننا چاہئے اور اگر خود مسلمانوں کی طرف سے اس کی مخالفت نہ ہوئی تو ظاہر ہے کہ اس قانون کی تشکیل میں کسی کو اعتراض نہ ہوگا۔ اسٹیٹسمین ۲۴ ستمبر

ایرو ٹیبلٹس کو کیوں ترجیح دیجاتی ہے!
اس لئے کہ
(۱) یہ کیفین واسپرین کی مروجہ ٹکیوں کی طرح دل کو کمزور نہیں کرتیں۔
(۲) یہ موسمی بخار۔ لرزہ کے بخار اور ہڈیوں میں دھنسے ہوئے بخار کیلئے پیغام شفا ہیں۔
(۳) تمام جسمانی درد۔ درد سر اور درد دندان۔ ان کے استعمال سے یقینی طور پر دُور ہو جاتے ہیں۔
(۴) ان کی قیمت اسپرین و کیفین کی ٹکیوں سے ایک تہائی کم ہے۔
قیمت فی ٹیوب ۲۰ ٹکیہ (فی ٹکیہ ۷½ گرین) ۱۴؍ چودہ آنہ۔
آپ کو تمام انگریزی دوا فروشوں سے مل سکتی ہیں۔
سول ایجنٹس
جی۔ ایس۔ برادر اینڈ کو چاندنی چوک دہلی
سب ایجنٹس۔ بیلی رام برادرز۔ انار کلی لاہور

بلاد اسلامیہ

سیاسیات ترکیہ

مسئلہ استحکام دردانیال ـــــ ترکوں کی سیاست خارجہ کا مقصد کچھ دنوں سے یہ چلا ہے کہ معاہدہ لوزان کی ان شرائط پر از سر نو غور کیا جائے جن کے ماتحت ترکی کو دردانیال اور جنوبی تھریس کے استحکام کی اجازت نہیں۔ لندن، جنیوا، پیرس اور ریاستہائے بلقان میں ترکی نے برابر اس امر پہ گفتگوئیں کی ہیں اور حبشی اطالوی نزاع کا مسئلہ پیدا نہ ہو گیا ہوتا تو شاید انجمن اقوام میں اس سال ہی بحث چھیڑ دی جاتی۔ لیکن ترکوں کی راہ میں برطانیہ فرانس اور اٹلی تینوں حکومتیں حائل ہیں اس لئے کہ اگر صلح ناموں پر نظر ثانی کی ابتدا کر دی گئی تو پھر اس کا کہیں خاتمہ نہیں ہوگا۔ علاوہ ازیں بحیرۂ اسود سے بھی ان حکومتوں کا کوئی نہ کوئی مفاد وابستہ ہے اور یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جنگ میں دردانیال کا راستہ کھلا رہے البتہ روس، یونان اور رومانیا ترکی کی تائید میں ہیں اور یوگوسلافیا صرف "اصولاً" اس کا مخالف۔ اس سلسلے میں اتاترک مصطفےٰ کمال کے ان الفاظ کو خاص اہمیت دی جا رہی ہے جو ڈیلی ٹیلیگراف کے ایک نمائندے سے دوران گفتگو میں انھوں نے کہے تھے ـــــ معاہدہ لوزان کے بعد اب دنیا کی حالت بہت کچھ بدل گئی ہے اور دردانیال کی بندش نے ترکی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ لہٰذا ہمارے اندرونی دفاع کے لئے آبناؤں کا استحکام ناگزیر ہے۔ بین الاقوامی لحاظ سے بھی ایسا کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس نہایت ہی اہم مقام کو کسی حملہ آور کے رحم پر چھوڑ دینا غلطی ہوگی۔ ترکوں کا فرض ہے کہ جو قومیں ان آبناؤں سے گذر کر امن عالم کو ختم کر دینا چاہتی ہیں ان کا راستہ روک دے"

ترکوں کو اس وقت اگر اپنے مطالبہ پر اصرار نہیں تو محض اس لئے کہ انہیں اتحاد خورد (Little Entente) اور ریاستہائے بلقان میں باہمی امداد کے معاہدات کی خواہش ہے۔ مزید براں جیسا کہ ماہرین فن کا خیال ہے ترک اس وقت بھی چند گھنٹوں کے اندر آبناؤں کو بند کر سکتے ہیں۔ معاہدہ لوزان کی پابندی

بھی اسی لئے یکجا رہی ہے کیونکہ ترک جب چاہیں یہاں سرنگیں بچھا سکتے ہیں۔ دردانیال کے جنوب میں جو غیر جنگی علاقہ ہے وہاں انھوں نے نہایت عمدہ سڑکیں طیار کر رکھی ہیں۔ پاس ہی توپوں کے ذخائر ہیں۔ جونہی آبناؤں کے استحکام کا حق حاصل ہوا یا کوئی ناگوار صورت حالات پیدا ہوئی ترک ان میں زمین دوز تارپیڈو کی نالیاں، آبدوز اور جنگی کشتیوں کے مراکز، مستقل زیر آب سرنگیں اور جدید ساحلی استحکامات قائم کر دینگے۔ اس سلسلے میں یہ خبر بھی دلچسپی سے سنی جائیگی کہ ترکوں نے فضائی استحکامات اور طیاروں پر خاص زور دینا شروع کر دیا ہے کیونکہ عصمت انونو وزیر خارجہ کی رائے میں جمہوریہ ترکیہ کو سب سے بڑا خطرہ فضائی حملے کا ہے۔

ماخوذ از کرنٹ ہسٹری — بیکر

مشرقی ترکستان

ایک مسیحی مسٹر ایچ ڈی ہے ورڈ مقیم کانسو (مشرقی ترکستان) نے رسالہ مسلم ورلڈ میں مشرقی ترکستان کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

چین کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ مشرقی ترکستان پر اس کا قبضہ قائم رہے۔ مغرب سے اپنا تعلق قائم رکھنے کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا لیکن چین نے یہ خواہش اس طرح پوری کی کہ حتی الوسع اس دور و دراز صوبے کے اندرونی حالات میں دخل نہ دے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ بایں ہمہ ذہانت اس زمانے میں چین کی یہ روش کیوں بدل گئی۔ غالباً اس کی ابتدا یانگ چینگ ہسن کے جانشینوں سے ہوتی ہے۔ چینی حکومت کا یہ فیصلہ جس قدر غلط ہے ظاہر ہے اس لئے کہ سیاسی لحاظ سے نہ سہی تو معاشی اعتبار سے مشرقی ترکستان روس کا ایک حصہ ہے روسی افواج اس وقت بھی اروچی کے نواح میں موجود ہیں اور پچھلی گرمیوں میں چینی افواج نے زنگیریا میں انہی کی امداد سے منگانیوں اور سفید روسیوں کے خلاف فتح حاصل کی اس وقت بھی وہاں جاپانی تربیت یافتہ جنرل شین چیہ تسائی کا زور ہے۔

روس نے اول بیرونی منگولیا میں دخل اندازی شروع کی۔ اب چینی ترکستان میں اس کا اثر بڑھ رہا ہے

خیال یہ ہے کہ بہت تھوڑے دنوں میں روس کا نسو ہیں ہونگے۔ معاشی حیثیت سے دیکھا جائے تو مشرقی ترکستان ہر لحاظ سے روس کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ مسٹر ینگ چاؤ ہسن نے زنگیریا کے متعلق اپنی روئداد مرتب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ تھیان شان کا شمالی رقبہ تیل اور ایندھن کے لئے روس کا محتاج ہے اس حقیقت سے تو شاید اہل چین کو بھی انکار نہ ہو کہ زنگیریا اب روس ہی کا ایک حصہ ہے۔ روسی ریلوں کا سلسلوں سن کیانگ (چینی ترکستان) کی سرحد پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس چین اور سن کیانگ میں آمدورفت کا کوئی معقول ذریعہ نہیں۔ راستہ میں بڑے بڑے صحرا حائل ہیں شورش و بدنظمی کا ڈر اس کے علاوہ ہے۔

مشرقی ترکستان کی آبادی ۲۰ لاکھ ہے جس میں پانچ فی صدی ہان یعنی چینی ہیں۔ کثرت ترکی عنصر کی ہے۔ تبتی، کالمک مغل اور کواسک بھی موجود ہیں لیکن کواسک بھی نسلاً ترک ہیں۔ گویا تمدنی اعتبار سے سن کیانگ ایک ترکی صوبہ ہے تعلیم کے لئے بھی لوگ مغربی ترکستان ہی کا رُخ کرتے ہیں یا پھر ترکی اور مصر کا معلوم یہ ہوتا ہے کہ مغربی ترکستان میں جو نئی رو شروع ہوئی تھی چینی ترکستان اس کی آخری کڑی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو قدیم ترکی سلطنت کی یاد از سرنو تازہ ہو جائے گی۔ زبان کا اتحاد بڑی چیز ہے۔ پھر انقرہ کا مختار کل مصطفےٰ کمال بھی اتحاد تورانیت کی طرف مائل ہے۔ روس نے اس کا علاج یہ سوچا ہے کہ تمام ملک کو جمہوریتوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود اتحاد توران کے خطرے سے انکار کرنا ناممکن ہے۔

'اتحاد اسلامی' کا البتہ ابھی کچھ ایسا موقعہ نہیں اس لئے کہ یہ تحریک اتحاد تورانی کے بعد ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔ یوں بھی اس کے راستے میں بہت سی مشکلات حائل ہیں۔ مصطفےٰ کمال نے خلافت کو ختم ہی کر دیا ہے۔ چینی مسلمان ہمیشہ آپس میں برسرپیکار رہے ہیں۔ اس وقت بھی ترکی اور تنگانی (چینی مسلمان) کو ایک دوسرے سے نفرت ہے۔ دونوں کی یہ کوشش کہ یہاں جمہوریت قائم ہو جائے جس طرح ناکام رہی اس کا سب کو علم ہے۔ کاشتکار ترکی بالطبع چینیوں کے طرفدار ہیں اور تنگانی اس لئے کہ اس طرح ان کو حکومت میں ملازمتیں ملتی ہیں۔ سردست جاپان اور روس دونوں چینی ترکستان پر آنکھیں لگائے بیٹھے ہیں لیکن انجام غالباً یہ ہو گا کہ مشرقی ترکستان پر ایک نرم سی چینی حکومت قائم رہے۔

ملخص از مسلم ورلڈ

مصر اور حبش

دولت برطانیہ اٹلی کے جارحانہ اقدام کو پسند نہیں کرتی اس لئے کہ اگر اٹلی کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوگئی تو جنوبی افریقہ سے اتصال کے علاوہ نیل اور بالخصوص نیل ازرق کا منبع یعنی جھیل تانہ ایک نئے افریقی حریف کے قبضے میں آجائے گا۔ برطانیہ مصر کا محافظ ہے لہذا یہ امر طے شدہ ہے کہ اسے نیل کے سرچشموں پر کسی دوسری طاقت کا تصرف گوارا نہیں چنانچہ ۱۸۹۸ء میں جب میجر مارشاں نے خرطوم سے کچھ دور نیل کے کنارے فرانسیسی جھنڈا لہرایا ہے تو قریب تھا کہ دونوں قوتوں میں جنگ ہو جاتی۔ بالآخر فرانسیسی عساکر اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔ ۱۹۰۲ء میں حبش سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کا ماحصل ہی یہی تھا کہ نیل ازرق پر ذخائر آب کی تعمیر کا حق محض انگلستان کو ہوگا۔ علیٰ ہذا ۱۹۰۶ء میں جب فرانس، ایطالیہ اور انگلستان نے حبش کو اپنے حلقہائے اثر میں تقسیم کیا ہے تو اس وقت بھی مغربی علاقہ جس میں جھیل تانہ اور نیل ازرق دونوں شامل ہیں انگلستان ہی کے حصے آیا تھا۔ نیل کی سیاسی اہمیت سے ہر شخص واقف ہے۔ مصر اور سودان دونوں کی زندگی نیل پر موقوف ہے۔ دوران جنگ میں جرمنی نے یہ کوشش کی تھی کہ نیل ازرق کے سرچشمہ پر بند لگا کر اس کے پانی کو ضائع کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر کبھی اس قسم کی کسی تجویز پر عمل ہو گیا تو مصر و سودان کا خاتمہ یقینی ہے۔

نیل ازرق کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے اس امر کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ اگست اور ستمبر میں مصر اور سودان زیادہ تر نیل اسی دریا سے سیراب ہوتے ہیں۔ ستمبر میں نیل ازرق کے پانی کی مقدار نیل ابیض کی نسبت دہ گنا زیادہ ہوتی ہے۔ پھر نیل ازرق کا چڑھاؤ اس وقت شروع ہوتا ہے جب نیل ابیض اُتار پر ہوتا ہے لیکن چونکہ نیل ازرق کی رفتار نہایت تیز ہے اس لئے اس کا سیلاب جلدی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا تدارک یوں ہو سکتا ہے کہ جھیل تانہ پر ایک بند لگا کر اس کا پانی سال بھر تک محفوظ رکھا جائے۔ چنانچہ اس قسم کے ایک بند کا تخیل چالیس برس سے قائم ہے اور اگر اس میں کوئی چیز حارج ہوتی رہی تو محض حبشہ کی داخلی بدنظمی اور اہل کلیسا کا یہ اعتراض کہ جس وقت جھیل تانہ کی سطح بلند ہوگی بہت سی مذہبی یادگاریں برباد ہو جائینگی۔ علاوہ ازیں مصر کا وطن پرور فریق بھی اس کا مخالف ہے۔ کیونکہ اگر یہ بند تعمیر ہوتا تو اس میں مصر کا روپیہ صرف کیا جاتا لیکن فائدہ انگلستان کو ہوتا و سودان

میں روئی کی کاشت کے لئے) بہرکیف ۱۹۲۵ء میں برطانیہ اور اٹلی میں نجی طور پر یہ سمجھوتہ ہوا تھا کہ اگر اٹلی جھیل تانہ میں بند لگانے کے متعلق برطانیہ کا حق تسلیم کرلے تو اس کو اعتراض نہ ہوگا کہ اٹلی ارتیریا اور اطالوی سومالی لینڈ کو حبشہ کے راستے ریل سے ملحق کرے۔ لیکن جب نجاشی کو اس بات کا علم ہوا تو دونوں حکومتوں نے اس کو اپنے حسن نیت کا یقین دلایا۔ علیٰ ہذا۔ ۱۹۲۷ء میں عدیس ابابا سے یہ خبر آئی تھی کہ بند کا ٹھیکہ ایک امریکی کمپنی کو دیدیا گیا ہے۔ اب برطانیہ نے جھیل تانہ پر اپنا حق قائم رکھنے کے لئے بند آب کی تجویز کو پورا کرنے کا تہیہ کرلیا ہے اہل حبش کو بھی انگریزوں کی ہمدردی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ قاہرہ کی ایک اطلاع کے مطابق مصری سوڈانی اور حبشی حکومتوں نے اس مسئلہ پر اتفاق رائے کرتے ہوئے بند کا ٹھیکہ "وائٹ کارپوریشن" کو دیدیا ہے۔ اور مفاہمت کی شرائط یہ ہیں کہ ۹۰ فی صدی مصارف مصری حکومت کے ذمے ہونگے اور باقیماندہ سوڈان کے۔ پانی میں بھی اس کا حصہ سوائے گا جس کو مزید روپیہ ادا کرتے پر پچاس فی صدی تک پہنچایا جاسکتا ہے حبش کو مفاہمت کی منظوری پر ۱۵ لاکھ اسٹرلنگ اور پچاس ہزار اسٹرلنگ سالانہ بطور کرائے کے ملینگے بعض چھوٹی چھوٹی شرائط ہیں مثلاً یہ کہ جھیل کا پانی مقررہ سطح سے بلند نہ ہونے پائے یہ بھی داخل ہے کہ عدیس ابابا سے بند آب تک ایک موٹر کی سڑک تعمیر کی جائے۔ جو ہر موسم میں آمد و رفت کے قابل ہو۔ بیکہ

ایران کی ترقیات

دولت علیہ ایران کے قنصل مقیم بمبئی نے موجودہ حکومت کی ترقیات کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس

وقت ایران میں تعلیم کا زور ہے عام مدارس کے علاوہ بہت سی صنعتی، حربی، سیاسی اور طبی درسگاہیں قائم ہیں۔ صرف طہران ہی میں طب، ادویہ سازی قانون و معاشیات، تعلیمات اور ہندسی کی یونیورسٹیاں موجود ہیں۔ مدارس میں ڈاک اور تار، زراعت، تجارت، فنون لطیفہ، صنعت و حرفت، موسیقی، فن حرب ریاضت اور کاروبار کے مدرسے قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں ہر سال بہت سے طالبعلموں کو اعلیٰ تعلیم اور جنگی تربیت کے لیے یورپ بھیجا جاتا ہے۔ ۱۹۲۳ء سے اب تک مدارس اور طلبا، دونوں کی تعداد میں دس گنا اضافہ ہوگیا ہے۔

تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ ایران میں ایک نہایت منضبط بری اور بحری فوج اور ہوائی عساکر موجود ہیں۔ ملی، زرعی اور پہلوی بینک قائم ہو چکے ہیں۔ ملی بینک کی ابتدا دو کروڑ ریال سے ہوئی تھی۔ اب یہ سرمایہ تیس کروڑ ریال تک پہنچ گیا ہے اور تمام اقطاع ملک میں اس کی شاخیں کام کر رہی ہیں۔

جدید ایران کی سڑکیں نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں۔ اب ملک میں باربرداری موٹروں کے ذریعے ہوتی ہے۔ قافلوں کا آنا جانا بند ہے۔ اس سے قبل سڑکوں کی حالت نہایت خراب تھی۔ مگر اس وقت عمدہ عمدہ سڑکوں کے علاوہ جن میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ریلوں کی تعمیر بھی جاری ہے۔ خیال یہ ہے کہ بحرۂ خزر کو بہت جلد خلیج ایران سے ملا دیا جائیگا بینکوں اور کاروبار کو خاص طور سے ترقی دی جارہی ہے ۔ معدنیات پر البتہ ابھی تک توجہ نہیں کی گئی وادیٔ کارون میں تیل کا عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر جگہ تیل کے چشموں کا پتہ چلتا ہے بالخصوص بوشہر کے عقب، جزیرۂ کشم اور بحیرۂ خزر کے کنارے کنارے۔ مختصر یہ کہ مراعات کی تنسیخ، جبری فوجی خدمت، کسٹم کا اضافہ، قانونی اور عدالتی اصلاحیں۔ سڑکوں اور ریلوں کی تعمیر، ملی، زرعی اور پہلوی بینک کا قیام، فوج، پولیس اور محافظین راہ کی تنظیم، ٹیلیفون تار، لاسلکی اور قدیم اوزان کی بجائے نظام عشاری کا رواج دور پہلوی کی یادگار ہیں۔ ملک میں امن و خوش حالی کا دور دورہ ہے۔ قبائل کو اسلحہ سے محروم کر دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کارخانوں کی تعمیر شروع ہے تاکہ صنعت و حرفت کو ترقی ہو۔

دکن ٹائمز

رجال ومشاہیر

محمد علی

کوئی صاحب ہیں اے، سی اڈی، انھوں نے جریدۂ اسٹیٹمین کی ایک اشاعت میں آج سے چالیس برس پہلے کے آکسفرڈ پر ایک طویل مضمون لکھا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت رئیس الاحرار کا ذکر بھی آگیا ہے "مولانا محمد علی نورتن کلب کے صدر تھے ــــ نورتن کلب انہیں نے قائم کیا تھا ــــ اور یار لوگ ان کو B OO M کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ یہ اسلئے کہ" وہ بیحد شگفتہ مزاج تھے، گلاب کا پھول انہیں بہت پسند تھا وہ ہمیشہ عمدہ لباس پہنتے تھے . . . ان کی تقریریں لطافت وظرافت سے پُر ہوتیں۔ اس وقت کسے خیال تھا کہ آگے چلکر انھیں ایک زبردست سیاسی رہنما بننا ہے۔ اس زمانے میں انھیں سیاسیات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی البتہ اتحاد اسلامی کا ضرور ان پر کچھ اثر تھا۔ ان کی تفریحات میں کوئی چیز حائل نہیں ہوسکتی تھی۔ گلاب پر وہ بہت سا روپیہ صرف کیا کرتے تھے۔ ان کا دل سونے کا تھا۔ افسوس ہے آج وہ ہم میں نہیں۔ میں اپنے والد کی آخری علالت میں ان سے بڑودہ میں ملا تو انھوں نے ان دکھ بھرے ایام میں مجھ سے جس خلوص اور ہمدردی کا سلوک کیا اُس کو میں کبھی فراموش نہیں کرونگا۔ وہ ایک بلند الشان تھے اور اگر وہ اپنی طبیعت پر ذرا سا قابو رکھتے تو یقیناً ان کا شمار اکابرین میں ہوتا۔"

یہ آج سے کئی سال پہلے کی بات ہے۔ پندرہ برس ہوئے کہ یہی محمد علی مسلم یونیورسٹی سے نکل کر ایک چھوٹے سے بنگلے میں بیٹھا ایک "اسلامی آکسفرڈ" کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کے دل کی وہی کیفیت تھی جو مضمون نگار نے بیان کی ہے۔ وہی محبت وہی خلوص اور وہی ہمدردی بلکہ اس سے بھی بڑھکر یہ کہ اسکے سینے میں دینی حرارت کا جوش تھا۔ اس کی شگفتہ مزاجی اور ظرافت پسندی بیشک اسی طرح قائم تھی لیکن اب نہ وہ لباس کا شوق تھا نہ گلاب کی محبت، تفریحات کا تو ذکر نہیں۔ محمد علی ایک میلے کچیلے مصلے یا ٹوٹی پھوٹی چٹائی پر بیٹھے ہیں اور گرد نو دار دان جامعہ کا حلقہ ہے۔ ان کی ہنسی گریئے سے بدل چکی ہے۔ ادھر اسلام اور مسلمانوں کے متعلق کوئی ذرا سی بات سنی اُدھر ان کا دل سوزو گداز سے بھر گیا۔ اس حال میں

نہ کھانے کی فکر ہے نہ آرام کی خواہش۔ اگر کوئی پابندی ہے تو نماز با جماعت اور درس قرآن کی۔ اے۔ ڈی سی صاحب کو افسوس ہے کہ انھیں اپنی طبیعت پر ذرا سا قابو ہوتا ... بیشک مگر کیا اچھا ہوتا اگر ان کے ساتھی بھی اپنی طبیعت پر ذرا سا قابو رکھتے، کاشکہ آج وہ پیکر حریت، وہ مجسمۂ ایثار و خلوص اور وہ شیروں کا شیر جس کے نام پر شجاعت اور بہادری کو ناز تھا ہم میں موجود ہوتا۔ آج ملت کو محمد علی کی کس قدر ضرورت ہے افسوس ہے ہم انکے وجود گرامی سے بہت جلدی محروم ہو گئے۔ اللہ تعالےٰ ان کو اپنی رحمت اور فضل کے سائے میں جگہ دے اور انکے مدارج کمال اور مقامات عالیہ میں ہمیشہ اضافہ کرے۔ آمین ثم آمین۔

امیر سعود

کپتان ایچ۔ سی۔ آرم اسٹرانگ نے ڈیلی ٹیلیگراف میں شہزادہ امیر سعود ولیعہد حجاز و نجد کے ورود انگلستان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے سعودی عرب کے آئندہ تاجدار کا یہ سفر مستثنیات میں سے ہے جس کا شاید کبھی اعادہ نہ ہوگا۔ کپتان صاحب کہتے ہیں میں نے سلطان سے خود یہ درخواست کی تھی کہ وہ انگلستان تشریف لائیں مگر انھوں نے کہا کہ حکومت کے لئے میرا یہاں ہر وقت موجود رہنا ضروری ہے۔ کوئی شخص ان کا نائب نہیں ہو سکتا۔ آج تمام عرب میں امن و امان ہے۔ قبائل خاموش ہیں۔ اور بحر احمر سے خلیج فارس یا بادیۃ الشام تک باطمینان سفر کیا جا سکتا ہے ... ابن سعود ایک زبردست شخصیت ہے، بے رحم مگر انصاف پسند .. لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے بعد کیا ہوگا ... ان کے بیٹوں میں کم از کم پچیس زندہ ہیں۔ دوسرے رشتہ دار انکے علاوہ "عرب ایک بنجر سرزمین ہے ... اور عربوں (بدوؤں) کے نزدیک زندگی محض غارتگری — چپکے چپکے کچھ آدمیوں اور جانوروں کا جمع ہونا کھلے آسمان میں رات کا سفر، اونٹوں کی تیز تیز حرکت اور ریت کے ٹیلوں پر رینگ رینگ کے چلنا۔ دوسری طرف ایک انتظار سے لبریز خوفناک اور مستعد نگہداشت۔ پھر کچھ نعرے اور کچھ چیخیں، گھوڑوں کی سرپٹ دوڑ، آتشباری، گرد و غبار، کچھ غارت، کچھ قتل دو ایک آدمیوں کا زخمی ہونا اور پھر خاموشی — سلطان نے مدت سے غارتگری کو ختم کر رکھا ہے۔ ایک دفعہ یومرہ نے نافرمانی کی تھی ان کو سلطان نے جو سزا دی وہ بدوؤں کو آج تک یاد ہے۔ یہ صرف ابن سعود کی شخصیت ہے کہ ملک میں

قانون اور امن کا احترام کیا جاتا ہے۔ نہ عرب میں کوئی نظام حکومت ہے۔ نہ حکومت کے عہدیدار... سوال یہ ہے کہ امیر سعود کہاں تک ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو سکیں گے...؟

امیر سعود ریاض میں پیدا ہوئے۔ وہیں پرورش پائی اور سوائے قاہرہ کے ایک سفر یا اب انگلستان آنے کے عرب سے کبھی باہر قدم نہیں رکھا۔ اس وقت بھی وہ براہ راست ریاض سے تشریف لائے ہیں — اندرون عرب کا ممنوع شہر جہاں بہت کم کسی مغربی کا گذر ہوا ہے۔

امیر سعود کی ساری زندگی وہابیوں میں گذری ہے... وہ احکام شریعت کے سختی سے پابند ہیں... اپنے قوی ہیکل باپ کی طرح شہزادہ ولیعہد کا قد بھی عام عربوں سے ایک فٹ لانبا ہے۔ ان کا بدن اگرچہ لاغر ہے لیکن مضبوط... جب وہ عربی لباس میں ایک غیر معمولی رعب اور دبدبے سے چلتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ حکومت اور فرمانروائی کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ امیر سعود ذہین اور سمجھدار آدمی ہیں وہ اپنے دل کی بات کو خوب جانتے ہیں اور بہت جلد کسی فیصلے پر پہنچ جاتے ہیں... ان کی فیاضی کی بعض اوقات کوئی وجہ نظر نہیں آتی لیکن بالعموم اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے..."

شہزادہ ولیعہد شکار اور گھوڑوں کے شوقین ہیں... ہر ہفتے وہ پچاس ساٹھ گھوڑوں کے ایک دستے کے ساتھ نکلتے ہیں اور کھلے صحرا میں نقلی لڑائیاں لڑتے ہیں... ان کی بہادری اور شجاعت مسلم ہے... اور بغاوت کے انسداد میں وہ اپنے باپ کی امداد بھی کر چکے ہیں۔ ابھی امیر کا سن صرف ۱۹ برس کا تھا کہ جلالت الملک کو بنو شمر کے خلاف جو ترکوں کے حلیف تھے تلوار اٹھانا پڑی۔ اس جنگ میں ولیعہد سلطنت نے بھی چند دستوں کی سرواری کی اور ایک بہادر عرب سپاہی کی طرح جو دھوپ اور گرمی سے بے پروا چند کھجوروں پر گذر کر سکتا ہے اپنی جوانمردی اور قوت برداشت کا سکہ بٹھا دیا — اس سال حج میں انھوں نے جس بے خوفی اور جسارت سے کام لیکر سلطان کی جان بچائی اس کا حال سب کو معلوم ہے — اور اب تو ایک سپہ سالار کی حیثیت میں بھی امیر سعود کی قابلیت مسلم ہے۔ پچھلے برس جب یمن اور حجاز میں جنگ ہوئی تو افواج کی قیادت اُنھیں کے ذمے ہوتی تھی اس مہم میں جنگی ساز و سامان — توپوں اور مسلح کاروں — اور دشوار گذار پہاڑوں کے باوجود کوئی چیز امیر کے رستے میں حائل نہیں ہو سکی۔ یمنی افواج چھ ہفتوں کی قلیل مدت میں منتشر ہو گئی اور صنعا تک تمام ملک سعودی لشکر

کی زد میں تھا۔ عامل ریاض اور نجد میں نائب سلطانی کی حیثیت سے بھی ولیعہد سلطنت کی لیاقت اور ذہانت کا بہت کافی امتحان ہو چکا ہے۔۔۔ امیر کی قابلیتیں ظاہر ہیں۔ قبائل کے انتظام میں ان کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ لہذا خیال ہے کہ جب آزمائش کا موقعہ آیا تو شہزادہ ولیعہد سے بڑھکر اور کوئی شخص سلطان ابن سعود کے نقش قدم پر نہیں چل سکے گا۔

آثار و مقامات

مزار نور جہاں بیگم

ہمارے مکرم دوست خواجہ عبدالرشید صاحب نے لاہور سے سول اینڈ ملٹری گزٹ کا ایک تراشہ بھیجا ہے جس کا ترجمہ ہم بجنسہ شائع کر رہے ہیں۔

لاہور کی اُن عمارات پر جو عہد مغلیہ میں تعمیر ہوئیں صرف ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس شہر پر کس کس کا اقتدار قائم رہا۔ جہانگیر کے مقبرے ہی کو دیکھ لیجئے۔ اب اس کا گنبد کہاں ہے؟ کیا یہ ایک گزرے ہوئے دَور کی بربریت کا زندہ ثبوت نہیں؟ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ جہاں ہندوستان کی ایک ممتاز خاتون کا مزار واقع ہے اسکے اردگرد ویرانہ ہی ویرانہ ہے جو بات کبھی بغض و حسد اور وحشت و جہالت سے بھی نہیں ہو سکی تھی اسکو اب وقت کا ہاتھ پورا کر رہا ہے۔ موسم برسات یا جو تھوڑی بہت بارش لاہور میں ہو جاتی ہے اس زمانے میں یہاں پانچ پانچ فٹ پانی کھڑا رہتا ہے سالہا سال سے اس مزار کی یہی کیفیت ہے اور اگر پانی کے اخراج کا کوئی انتظام نہیں ہوا تو عمارت کی بنیادوں پر اس کا اثر نہایت خراب پڑے گا ہمیں یہ بھی شکایت ہے کہ جس عظیم الشان خاتون نے کبھی ایک سلطنت پر حکومت کی تھی اس کی آخری آرامگاہ کی تزئین و آرائش پر کبھی توجہ نہیں کی گئی اگر کسی مقبرے کو قائم رکھنے کی ضرورت ہے تو وہ نور جہاں کا مزار ہے ہندوستان کی کس قدر کتابوں اور کس قدر اشعار اور ناولوں اور فلموں کا موضوع نور جہاں بیگم ہے مقام عبرت ہے کہ اسی نور جہاں کا مقبرہ، فارسی کے اس شعر کا مصداق ہے "بوم نوبت می زند بر گنبد ــــــ"

ایک زمانے میں مسیح الملک کی کوششوں سے اس مزار کی مرمت ہو گئی تھی کیا محکمہ آثار قدیمہ اس طرف توجہ نہیں کریگا؟

جہاں گزراں

دو مسافر

از احمد بے

برسات کی ایک گرم اور تکلیف دہ رات ۔ میل ٹرین اپنی پوری رفتار سے حرکت کر رہی ہے۔ مسافر کچھ سوتے ہیں، کچھ سونے کی کوشش میں ایک دوسرے پر گرے جا رہے ہیں۔ کبھی کسی اسٹیشن پر گاڑی رکتی ہے تو سارا کمرا اینٹھنوں سے بھر جاتا ہے۔ اس وقت بعض لوگ سوتے سوتے جاگ اٹھتے ہیں اور گھبرا کر اپنے ہمراہیوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اداس، تھکے ماندے اور نیند سے پریشان چہرے ۔ دو ایک کروٹیں، دو ایک جمائیاں اور پھر وہی نیند۔ معلوم ہوتا ہے سارا منظر ایک بھیانک خواب کا ہے۔

کمرے کے عین وسط میں دو مسافر خاص طور سے بے آرام نظر آتے ہیں۔ دونوں کے بستر ایک دوسرے کے متصل ہیں — ایک کا بیچ کی نشست پر اور دوسرے کا کھڑکیوں کے ساتھ — دونوں کی آنکھیں نیند سے خالی ہیں اور دونوں ذرا ذرا سی دیر میں اُٹھکر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھ لیتا ہے لیکن وہاں کیا ہے؟ تاریک اور سنسان میدان جس کی لامحدود وسعت گاڑی کے شور سے گونج اُٹھتی ہے۔ دوسرا سگرٹ سے دل بہلاتا ہے مگر کہاں تک۔ آخر کار دونوں خاموشی سے اُکتا گئے۔ اس لئے کنارے کی نشست پر لیٹے ہوئے مسافر — ایک دبلا پتلا نوعمر ہندستانی — نے ایک مرتبہ یونہی اپنے ہمراہی سے کہا "رات کیسی گرم ہے؟"

"بیشک" اس کے رفیق سفر نے متانت سے جواب دیا اور یہ کہتے کہتے سگرٹ کی ڈبیا پیش کی جس کو اس کے ساتھی نے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ باوقار اور سپاہی وضع مسافر افغان ہے یا ایرانی۔ دو ایک منٹ راستے کی بے آرامیوں پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر ہندوستانی مسافر کا

شوق استفسار غالب آیا اور اس نے اپنے ہمراہی سے پوچھ ہی لیا "آپ کابل سے تشریف لائے ہیں؟"

"نہیں کاشغر سے۔"

کاشغر سے! کشمیر کے راستے؟ ... آپ ابتدائے بہار ہی میں وہاں سے چلدیئے ہونگے۔ بڑا دشوار گذار راستہ ہے۔

اور کاشغری مسافر نے تسلیم کیا کہ بیشک کاشغر سے کشمیر کا راستہ طویل بھی ہے اور دشوار گذار بھی اور اس کا سفر واقعی ابتدائے بہار میں شروع ہوا تھا۔ مگر یہ کہ اس بہار میں نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے دو سال ہوتے۔"

تو آپ نے ہندوستان کے اکثر مقامات دیکھے ہونگے؟ لاہور، دہلی ..."

"جی ہاں۔ تجارت کا مشغلہ ہی ایسا ہے۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر ترکستان کی باتیں شروع ہوگئیں۔ آج سے دو برس پہلے جو ہنگامہ شروع ہوا تھا وہ کیونکر فرو ہوا۔ مسلمانوں کی اب کیا حالت ہے۔ ترک اور تنگانیوں میں اتفاق کیوں نہیں؟ نو عمر ہندوستانی نے یہ اور اس قسم کے متعدد سوالات پوچھنا شروع کئے۔ کاشغری تاجر ہر بات کا جواب دیتا جاتا تھا۔ ترک اپنے مستقبل سے غافل نہیں لیکن انہیں ہزاروں سیاسی فتنے کام کر رہے ہیں۔ روس کا تجارتی غلبہ چین کی ریشہ دوانیاں۔ تنگانیوں کی اسلام نا فہمی نو عمر ہندوستانی کی توجہ بظاہر اپنے رفیق سفر پر تھی لیکن اُس کی آنکھیں اُن وسیع اور دور دراز میدانوں کا تصور کر رہی تھیں جو سلسلہ کیون لن اور تھیان شان کے دامن میں واقع ہیں۔ ایک طویل و عریض ریگستان، جا بجا پہاڑ اور سنگلاخ ٹیلوں کا سلسلہ کہیں کہیں مختصر سی وادیاں اور چھوٹے چھوٹے نخلستان۔ کیا یارقند اور کاشغر کے نواح میں طارم کی وہی آب و تاب ہے۔ جو وادیٔ کشمیر میں جہلم کی؟ ناممکن۔ ترکستان میں وہ سرسبزی اور سیرابی، وہ پانی کی کثرت، درختوں کے جنگل، سر بفلک پہاڑ اور برف آلود چوٹیاں کہاں مگر تصویروں میں تو کاشغر اور یارقند کے سفیدے ویسے ہی دلفریب معلوم ہوتے ہیں۔ بہرکیف ایک بات ضروری ہے نسل، مذہب اور تہذیب و تمدن کی یکسانی کی طرح کشمیر، ترکستان، ایران، کابل بلکہ تمام وسط ایشیا کے

عام منظر اس کی آب و ہوا' نباتات اور فصلوں کے تغیر و تبدل میں ایک اشتراک سا قائم ہے...."

گاڑی کے ایک خفیف سے جھٹکے نے جو ایک چھوٹے سے اسٹیشن سے گذر رہی تھی ہندی مسافر کے سلسلۂ خیال کو توڑ دیا۔ پٹریوں کے ملنے سے پہیوں کی آوازیں ایک خاص قسم کی تبدیلی' دھچا اور روشنیاں ایک بڑی سی شعل ۔ رات کی تاریکی میں باہر کی عمارتیں سائے کی طرح حرکت کرتی نظر آتی تھیں۔ اس کا ترک ہمراہی معلوم نہیں کیا کہہ رہا تھا کاشغر کی مساجد و مقابر' قدیم درسگاہیں' جدید تعلیمی سرگرمیاں . ."

ہندی مسافر نے پوچھا۔"ژنگیریا روس کے زیر اثر ہے۔ منگولیا برائے نام آزاد' شمالی چین پر جاپان کا قبضہ ہے۔ کاشغر اور یارقند کا انجام کیا ہوگا ؟

معلوم ہوتا ہے کاشغری تاجر اپنے وطن کے جدید تغیرات سے ناواقف تھا۔ اس نے عالم اسلامی کے انحطاط اور مسلمانوں کی بددلی کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ اس طرح جو باتیں شروع ہوئیں ان کا سلسلہ لحظہ بلحظہ بڑھتا گیا۔ دونوں ہمراہی نہایت جوش اور سرگرمی سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ انہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ رات کا بہت سا حصہ گذر گیا ہے۔ اب ہوا میں کس قدر خنکی اور لطافت پیدا ہو چلی تھی ایک مرتبہ ترک سیاح کی آنکھ جھپک گئی۔ یہ دیکھ کر نوعمر ہندوستانی بھی لیٹ گیا۔ لیکن اس کے دل میں خیالات کا ہجوم تھا۔ "اسلامی ممالک ایک دوسرے سے کس قدر دور ہیں لیکن ان کے مسائل اور ان کی دشواریاں کس درجہ مشترک۔ ان کے خیالات ان کے جذبات اور ان کے عوام سب ایک . . . اگر ان کی مشکلات ایک ہیں اور ایک ہی چیز نے ان کے عروج و ترقی کو انحطاط سے بدل دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان مشکلات کا حل ایک نہ ہو یقیناً عالم اسلام کا نشو و نما با وصف اختلافات مشترک ہوگا. . . یہ سب اسلام کا فیض ہے۔ اس نے فی الواقع نسل اور وطن کے بتوں کو توڑ ڈالا ہے۔ مسلمان آج بھی ایک وسیع اخوت اور عالمگیر برادری ہیں اور ان کے ذہنی اشتراک سے ان کا جذباتی اتحاد کہیں زیادہ شدید اور گہرا . . . لوگوں نے مسلمانوں کی باہمی لڑائیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اتحاد اسلامی ممکن نہیں . . . لوگ غلط کہتے ہیں اتحاد اسلامی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس کو ایک اخلاقی یا روحانی علاقے تک محدود رکھنا غلطی ہے۔ وہ ایک ملی اشتراک ہے۔ جس کا اس وقت بھی انکار ممکن نہیں . . . مسلمانوں کا جنگ و جدال اور ان کا

باہمی نزاع ایک وسیع کینے کے بجی اختلافات ہیں انتشار و تفریق کے لئے نہیں توافق و تطابق کے لئے۔ عالم اسلامی اپنی ہیئت اجتماعیہ کا مسئلہ حل کرنا چاہتا ہے۔۔۔ دنیا کی کوئی دو قومیں اس طرح آپس میں نہیں ملتیں جس طرح دو مسلمان۔ ان کا وطن ایک دوسرے سے کتنا ہی دور ہو وہ اپنے مسائل پر اسی شغف اور انہماک سے گفتگو کرتے ہیں جس طرح ایک گھر کے دو آدمی۔۔۔!!

اب جو ہندی مسافر کی آنکھ کھلی ہے تو سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ لوگ کچھ اُٹھ چکے تھے کچھ اُٹھنے کی کوشش میں تھے۔ ایک گوشہ میں ایک عمر رسیدہ مسلمان سربسجود تھا۔ رفتہ رفتہ کمرے کا رنگ بدلنا شروع ہوا۔ جن مسافروں کو قریب جانا تھا وہ اپنا سامان درست کرنے لگے۔ اگلے اسٹیشن پر ہی بہت سے مسافر اُتر گئے —— نو عمر ہندوستانی بھی۔

کہ سوتے سوتے جو چونک اُٹھے مگر کوئی تم نے خواب دیکھا؟
کرنٹ ہسٹری

انگریز کیا ہیں؟

ماخوذ از ہیرلڈ نکلسن —— لسنر بحوالہ لونگ ایج

انگریز کیا ہیں؟ صرف انگریز۔ ان میں اسکاٹ آئرش یا اہل ویلز شامل نہیں —— اور وہ بھی صرف اس لحاظ سے کہ فرانسیسی، جرمن اور اہل امریکہ ان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ ہمارا ذکر کرتے ہیں تو اس وقت ان کے ذہن میں ایک انگریز کے خدوخال جو شکل اختیار کرتے ہیں اس کی ہیئت بالعموم کیا ہوتی ہے بعینہٖ جس طرح ہم نے ان کی خیالی سی تصویر قائم کر رکھی ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ ایک فرانسیسی کی شکل و صورت انگریزوں کے نزدیک یہ ہے کہ وہ ایک پست قامت سیاہ رنگ اور زندہ دل انسان ہے جس کا لباس ہمیشہ سیاہ اور دستانے کتے کی کھال کے ہوتے ہیں؟ اور جرمنوں کے متعلق تو باوجود

گرمی کی تیزی ——— اسٹرب

اسٹیٹسمین

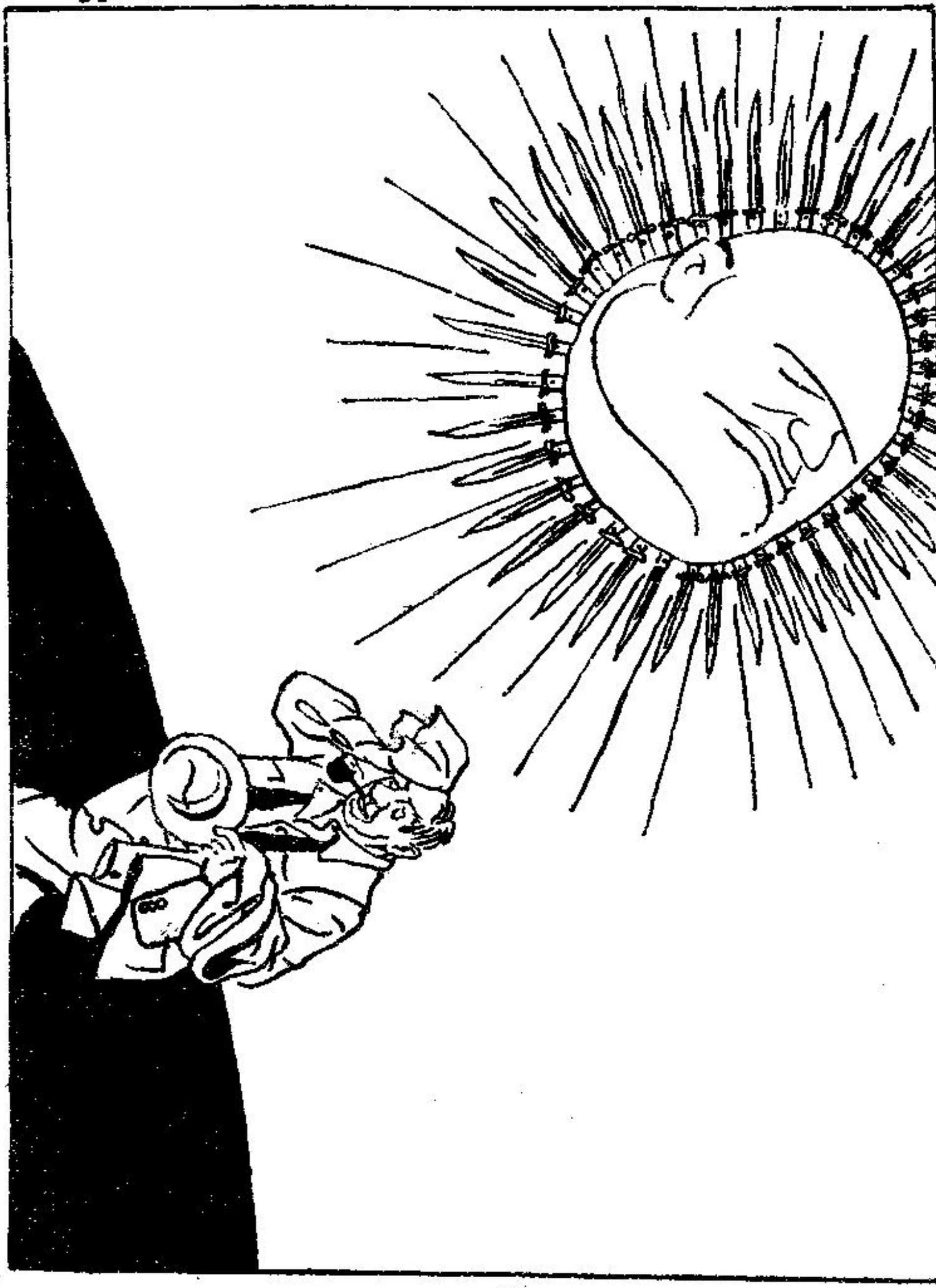

گذشتہ انقلاب کے ہم نے اپنی یہ رائے ابتک نہیں بدلی کہ دنیا میں جو بھی جرمن ہے اُس کی گردن سانڈ کی طرح موٹی ہوگی اور جسم گویا بیر کا مٹکا۔ انگریزوں کا خیال ہے کہ ہر جرمن کی ہیٹ سبز ہوتی ہے۔ علی ہذا کوئی بھی امریکن ہو ہماری نظر میں وہ ایک دبلا پتلا کم آواز سا آدمی ہے۔ آنکھوں پر سینگ دار کناری والی عینک اور منہ میں سگار۔ یہ حلیہ ہے اہل جرمنی فرانس اور امریکہ کا جس پر اختلاف جزئیات کے باوجود غالباً سب انگریز متفق ہونگے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا ان لوگوں کے ذہن میں بھی کوئی ایسا تصور موجود ہے جو ہماری پوری قوم پر منطبق ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک اہل جرمنی، فرانس اور امریکہ نے انگریزوں کی شکل وصورت اور وضع وہیئت کی ایک بہت واضح اور مکمل تصویر قائم کر رکھی ہے لیکن یہ ایسی ہی غلط اور حقیقت سے دور ہے جس طرح خود ہمارے تصورات ان کے متعلق

بدقسمتی سے یہاں ہمارا خیال اس "قلیل القامت" شخص کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے جس کا خاکہ اسٹرب نے طیار کیا ہے —— اسٹرب کا ایک کارٹون اس اشاعت میں موجود ہے اور اس میں اس کا قلیل القامت شخص بھی —— یعنی ایک پست قد، ضدی، بوکھلایا ہوا مگر شفیق، محبت پسند اور منکسر المزاج چھوٹا سا آدمی اس کے سر پر بولر (ٹوپی) ہوگی اور ہاتھ میں چھتری۔ لیکن اس خیال کے ساتھ ہی ایک بلند تر انسان کی صورت ہمارے ذہن پر چھا جاتی ہے اور اسٹرب کا قلیل القامت آدمی رفتہ رفتہ مسٹر اسٹینلی بالڈون کی سی زیادہ پُر رعب شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ کیفیت ہے اس پختہ مزاجی، دیانت، نیک طبعی، تساہل اور بے رنگی کا ایک خیالی تصور قائم کرنے کی جو راقم الحروف کے نزدیک ہم انگریزوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک جرمن کے نزدیک ہماری وضع قطع اور عام حلیہ کیا ہوسکتا ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ وہ کسی انگریز کا تصور مسٹر اسٹینلی بالڈون کی شکل میں کرے۔ اس کے ذہن میں تو اسٹرب کے قلیل القامت شخص کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر انگریز کسی سے مشابہ ہیں تو مسٹر جیک ہلبرٹ سے یعنی ایک لمبے قد کا جنٹلمین آدمی جو ہمیشہ صاف ستھرا لباس پہننے کا عادی ہے۔ اس کے سر پر ٹاپ ہیٹ ہوگی اور گلے میں فراک کوٹ۔ اسپیٹ اور عینک اس کا جزو زندگی ہیں۔ علی ہذا ایک مختصر سا پائپ جس کو وہ بڑی تمکنت سے اپنے بڑے بڑے جبڑوں میں دبائے رکھتا ہے۔ یہ ہیئت ہے اس قوم کی جو

اہل جرمنی کے نزدیک تمام دنیا سے حسد رکھتی ہے اور جس نے اپنے مکر و فریب ریاکاری اور مادیت پرستی کو چھپانے کے لئے پارسائی اور راستبازی کا جامہ اوڑھ رکھا ہے۔ جرمنوں کا خیال ہے کہ دنیا میں جو بھی انگریز ہے بڑا ہی ہوشیار اور بے حس منافق ہے۔ جو اپنی مافوق الفطرت دانائی اور بصیرت کے زور سے ہر بازی جیت لیتا ہے۔ تجارت اور کاروبار کا اسے کوئی سلیقہ نہیں۔ لیکن اس کی تلافی وہ اپنی ناجائز اور پرفریب چالبازیوں سے کرتا ہے۔ ایک بے مہر سنگ دل مگر دور اندیش موقع شناس، مغرور، منفعت بین اور خود پسند بازاری سا آدمی۔ معلوم نہیں اس میں کبھی کبھی وہ رحمدلی اور فیاضی کہاں سے آجاتی ہے جس کے لئے خود ان کی اپنی زبان میں کوئی لفظ نہیں سوائے "حسن معاملہ" کے جس کا المانوی الاصل ہونا قطعی ظاہر ہے۔

یہ خیالات ہیں اہل جرمنی کے۔ اب فرانسیسیوں کو لیجئے۔ ان کا ذہن سب سے پہلے انگریز عورتوں کی طرف منتقل ہوگا۔ پتلی۔ دبلی، موسم زدہ، نہایت درجہ بدلباس اور رنجورہ کنواریاں جو اپنے ہاتھ میں ایک سبز سی چھتری لئے ہمیشہ ٹیکسی ڈرائیوروں کو دھمکایا کرتی ہیں۔ یہ ناخوشگوار تصور ہے انگریز عورت کا جس پر اہل فرانس ہمارا ذکر کرتے ہوئے ایک اجڈ، بیوقوف، مغرور، متکبر اور جہالت آمیز چہرے کا اضافہ کرلیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انگریزوں کا رنگ غیر معمولی طور سے سرخ ہوتا ہے۔ گویا ان کو سب سے زیادہ فکر ہمارے رنگ کی ہے۔ وہ اس کے خیال ہی سے پریشان ہو جاتے ہیں اور ان کے نزدیک یہ نتیجہ ہے نیم پخت گوشت کھانے کا۔ محض اس بنا پر انھوں نے ہمیں وحشی اور گنوار سمجھ رکھا ہے۔ اہل جرمنی سے وہ صرف ایک بات میں متفق ہیں اور وہ یہ کہ فرانسیسیوں کی نظر میں بھی کوئی انگریز منافقت سے خالی نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جرمنوں کے نزدیک ہم بڑے ہی تیز اور طرار منافق ہیں اور فرانسیسیوں کی رائے میں احمق اور بیوقوف۔

البتہ اہل امریکہ کو ان دونوں کے برعکس ہمیں دیکھ دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ حسن آداب اور حسن ظرافت سے عاری دکھاوے اور سرپرستی کے شوقین ہیں۔ جرمنوں کی طرح اہل امریکہ کا بھی یہی خیال ہے کہ انگریز ایک لاغر اندام قوم ہیں۔ صاف ستھرے لباس اور چشمہ لگانے کے عادی لیکن بجائے اس کے کہ وہ ہماری اس شان اور رعب داب سے متاثر ہوں ان کو الٹی اس پر ہنسی آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ امریکہ کے سیاست داں انہیں ہمیشہ اس امر کی تلقین کرتے رہتے ہیں کہ ہم ایک بے رحم اور شہنشاہیت پسند قوم ہیں جن کا کام ہی یہ ہے

کہ کمزوروں اور زیردستوں کو تنگ کرتے رہیں۔ بایں ہمہ وہ ان الزامات کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک ہماری وضع قطع اس قدر دلچسپ، ہمارا لب و لہجہ اتنا مضحکہ خیز اور ہمارے طور طریق ایسے لطف انگیز ہیں کہ انگریز کیا ہیں گویا ایک طرح کے مسخرے جن کی ہیئت کذائی پر بے اختیار ہنسنے کو جی چاہتا ہے راقم الحروف کو یقین ہے کہ اہل امریکہ کا یہ خیال خود ان کے شعور ذات اور احساس پستی پر مبنی ہے لیکن یہاں ہمیں قوموں کے دماغی اختلال سے بحث نہیں۔ مزید براں ۱۹۴۰ء سے انکی رائے ہمارے متعلق بہت کچھ بدل گئی ہے۔ ان میں سے بعض لوگوں نے سوچنا شروع کر دیا ہے کہ ممکن ہے انگریزوں میں سچ مچ رحم و شفقت کا مادہ موجود ہو اور کیا عجب کہ ان کے اخلاق و عادات میں اچھے عناصر بھی پائے جاتے ہوں ۔ وہ عناصر جنکی خود اہل امریکہ کو تمنا ہے ۔ علی ہذا ان کا یہ خیال بھی کہ ہم بہت سادہ لوح ہیں ایک حد تک بدل چکا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں شاید ہم اتنے بیوقوف نہیں جتنے بظاہر معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ فرانسیسیوں کو یقین ہے کہ ہم اپنی صورت سے کہیں بڑھکر احمق واقع ہوتے ہیں اور جرمن بیچارے جو اس امر کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے کہ دوسروں کو سمجھ سکیں برابر اس چکر میں ہیں کہ انگریز بڑے ہی عیار بے حس اور انانیت پسند لوگ ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اہل جرمنی، امریکہ اور فرانسیسیوں کے دل میں یہ غلط فہمیاں کیونکر پیدا ہوئیں غالباً بہت سے انگریز راقم الحروف سے اس بات میں متفق ہونگے کہ ہم سب اسٹرب کے قلیل التعامت شخص کی طرح ایک شرمیلی نیک مزاج، شفیق، مہربان، ضدی اور کم علم قوم ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو لوگ کس بنا پر ہمیں غرور و تمرد، منافقت اور حیلہ جوئی کا طعنہ دیتے ہیں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر اقوام نے ہماری عادات و خصائل کا اندازہ کرتے ہوئے دو باتوں کا خیال نہیں رکھا۔ اول یہ کہ ہم ایک حجاب پسند قوم ہیں۔ لہذا دوسروں کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ہمیں ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح ہماری عادات و اخلاق میں جو "رکاوٹ" سی پیدا ہو گئی ہے اس کو غلطی سے لوگ غرور اور نخوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اہل امریکہ کہتے ہیں کہ ہم میں رعونت ہے تصنع وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ہم میں کچھ بھی نہیں، ہم صرف اسکول کے بچوں کی طرح پریشان اور بوکھلائے ہوئے رہتے ہیں۔ اسی طرح جب اثنائے گفتگو میں ہم دفعتہً خاموش ہو جاتے ہیں اور ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ہم کہیں تو کیا کہیں

توفرانسیسیوں کو خیال گذرتا ہے کہ ہم واقعی احمق اور بیوقوف ہیں لیکن جرمن اسی بات کو مکر وریا اور فریب کاری پر محمول کرتا ہے۔

اس غلط فہمی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ہماری قوم میں دوراندیشی نام کو نہیں۔ کوئی معقول انگریز اس بات کو پسند نہیں کریگا کہ پہلے ایک تجویز سوچے اور پھر اس پر عمل کرے وہ ہمیشہ اپنی جبلتوں کے اشارے پر چلتا ہے۔ لیکن چونکہ ہماری جبلتیں نہایت صحیح واقع ہوئی ہیں لہذا ہم کامیاب ہوتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ہم چلتے کہیں ہیں اور پہنچتے کہیں۔ اس سے بہرحال غیر قوموں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ ہم نے ہمیشہ منافقوں کی طرح اپنے ارادوں کو چھپایا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اپنی منزل مقصود کا خوب علم تھا حالانکہ انگریزوں سے اس ذہانت کی توقع رکھنا ہی بے سود ہے۔ لہذا فرانسیسیوں نے جو ہماری سادہ لوحی سے خوب واقف ہیں ہمیں بیوقوف سمجھ رکھا ہے برعکس اس کے اہل جرمنی ہماری کامیابیوں سے متاثر ہیں اور ان کو یہ خیال ہو چلا ہے کہ ہم بڑے ہی مکار ہیں۔ اس بات پر بہرکیف دونوں متفق ہیں کہ تہذیب و تمدن انسانی کی تاریخ میں ہم سے بڑھکر کوئی منافق پیدا نہیں ہوا۔ ایسا منافق جو اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہو۔

حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ انگریز ایک نیک طبیعت متحمل مزاج اور بے حد شرمیلی قوم ہیں ان کو دنیا میں کسی سے بغض یا عداوت نہیں۔ بیشک اسٹرب کے قلیل القامت شخص کی طرح ہم میں سلیقہ بھی ہے اور معقولیت بھی اور ہمیں اپنی پریشانی اور گھبراہٹ اور مخبوط الحواسی کا بھی اقرار ہے۔ ممکن ہے ہم بھی اہل جرمنی کی تخیل پسندی، فرانسیسیوں کی متانت نا بلند نظری اور امریکہ کے تپاک اور گرمجوشی کے متعلق ایسی ہی غلط فہمیوں میں مبتلا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے قوموں کو ایک دوسرے کا اندازہ کرنے میں اکثر دھوکا ہوتا ہے۔

ہمارے معاصرین

ہندوستانی تہذیب اور اسلام

زمانہ (جولائی ۱۹۳۵ء) میں مسٹر این سی مہتہ آئی سی ایس کے اس خطبے کا ترجمہ شائع ہوا ہے جو ایک سال ہوا انھوں نے پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مظفر نگر میں پڑھا تھا۔ مہتہ صاحب کے مضمون کے بعض دلچسپ اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"... اسلام کی قوت اس کی سادگی اور رحمدلی میں ہے۔ سب سے زیادہ اس کی دعوت عمل اس تنبیہ میں مضمر تھی کہ قول اور عمل کی مطابقت ضروری ہے۔ اسلام ہمیشہ بت پرستی، باطل توہمات اور مذہب میں چھپی ہوئی بربریت کو گوارا کرنے سے منکر رہا... اسلام کی سادہ تعلیم سے... قدیم تہذیبیں حیرت زدہ ہوگئیں... عورتوں کو حق وراثت دیا گیا... ہندو عورت کو شکتی یعنی قوت کا مظہر سمجھتے ہیں... لیکن معاشرتی نظام میں اس کی جداگانہ حیثیت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے.. حالانکہ عورت کا مرد کے ساتھ حصہ چاہنا ایسا دعویٰ ہے جس کے جائز ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہندو ذہنیت ایک چاپلوس ذہنیت ہے۔ وہ یا تو آپ کا دعویٰ تسلیم کرنے کو طیار ہو جاتا ہے یا منطق کے آخری حدود تک استدلال کر سکتا ہے مگر اس حالت میں کہ قول اور عمل کی مطابقت کا مطالبہ نہ کیا جائے..."

وہ (مسلمان) آنکھوں سے دیکھ چکے تھے کہ بت پرستی باطل عقائد اور روایات اصنام پر ایمان لانا کیسا خسران عظیم ہے... وہ جانتے تھے کہ عوام کا ذہن اندرونی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا اس کا نتیجہ جو ہونا تھا ہوا۔ ہندوستان کی دولت سے لبریز مندر مسلمانوں کو ظلمت کدے نظر آئے۔ ان کو مسمار کر دینا... جس بات کو ہندو مذہبی بے حرمتی سمجھتے تھے مسلمانوں کے نزدیک تبلیغ کا ایک مفید اور بہتر طریقہ تھا... جس کی وجہ سے صدیوں کی گندگی آن واحد میں دور ہو جاتی... مسلمانوں کی بُت شکنی تو سب جانتے ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ایک متقی مسلمان فرمانروا فیروز تغلق

بڑے احترام اور احتیاط سے اشوک کے فرمان کا ستون میرٹھ سے دہلی لایا تھا۔ ٹیپو سلطان کی نسبت طالبعلمی میں جو رائے قائم کی تھی اُس مدنظر رکھتے ہوئے مجھے بڑی حیرت اور خوشی ہوئی کہ میسور کے حیرت انگیز مندر اُس بت شکن کے ہاتھوں محفوظ رہے۔۔۔ ہز ایگزالٹڈ ہائنس نظام حیدرآباد کی ان اہتمام بالشان مساعی سے کون واقف نہیں جو اجنتا اور ایلورا کے برہمنی اور بودھی آثار کے تحفظ میں کی گئیں۔۔۔ ہمیں اس پر تعجب نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اسلام نے ہندوستان میں کوئی نئی قوم آباد نہیں کی۔ اسلام یہاں صرف ایک نورانی مشعل لایا تھا جس نے۔۔۔ انسانی زندگی کی چھائی ہوئی ظلمتوں کو پاک کر دیا۔

یہ خیال غلط ہے کہ اسلام نے اس ملک کو پردے سے روشناس کیا عورتوں کی خانہ نشینی کا رواج تمام قدیم ملتوں میں پایا جاتا ہے اور ہندو تہذیب کے عروج کے زمانے میں بھی اُمرا کا طبقہ سختی کے ساتھ اس پر عامل تھا۔۔۔ یہاں پر ہندو مسلمانوں کے باہمی ازدواج کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ بادشاہوں کی بین الملی شادیاں اتحاد کا باعث نہ ہوئیں۔۔۔ یہ صرف ہندوؤں کی پستی کی دلیل اور اس بات کا ثبوت تھیں کہ اُن کی جماعتی تنظیم کا دائرہ خود ہندوؤں پر تنگ ہو رہا ہے۔

ہندو مذہب کا اصل جوہر مختلف طبقوں کا فرق مراتب ہے۔۔۔ یہ سچ ہے کبھی کسی شاعر دھماتما اور مصلحان قوم کی آواز ذلیل قوموں کی حمایت میں بلند ہو جاتی تھی مگر خاندان کی پستی کی اس دنیا میں کوئی تلافی نہیں ہو سکتی تھی۔۔۔ اسلام کو مساوات پر اتنا اصرار تھا کہ اس میں سمجھوتے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔۔۔ یہ بنیادی اصول ہندو تمدن کے لئے بالکل نئی چیز تھا۔ لہٰذا اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ اشاعت مذہب میں اسلام کی فتحیابی کا باعث پست اقوام کا اس میں بخوشی داخل ہونا تھا۔۔۔ لیکن اگر یہ مزید امداد نہ بھی ہوتی تو اسلام اور زیادہ تیزی کے ساتھ اشاعت پاتا۔۔۔ البیرونی نے لکھا ہے ہندو قوم مغرور اور تعصب پسند ہے۔۔۔ وہ جب تک غیر قوموں سے مساویانہ سلوک نہ کرینگے اور کھانے پینے کے فرضی قیود کے پابند رہیں گے ان میں باہمی اتحاد و اتفاق ناممکن ہے ایک ہزار سال گذر چکے ہیں مگر یہ قدیم پابندیاں اب بھی موجود ہیں۔۔۔ عہد وسطیٰ کے مسلمان کی وہی کیفیت تھی جو آج مغربی خیالات کے ہندوستانی کی ہے۔۔۔ وہ کبھی عملی مثال سے لوگوں کو متاثر کرتا تھا کبھی جبر سے۔۔۔ مگر تلوار سے کبھی اعتقاد نہیں

بدلتا... یہی وجہ ہے کہ اسلام ہمیں اپنی برکات سے پوری طرح فیضیاب نہیں کر سکا۔"

آٹھویں صدی میں عربوں کی آمد سے لیکر سولھویں صدی تک جب مغلوں نے ہندوستان میں قدم رکھا ہے مختلف قسم کی مذہبی تحریکات نمایاں نظر آتی ہیں ان کا مقصد یہ تھا کہ عوام الناس کا درجہ بلند کیا جائے... بھگتی کا مذہب... اسلام کے سبب ہر دلعزیز ہوا... کبیر، رامانند، داؤ دیال اور ملک داس عوام ہی سے پیدا ہوئے اور توحید و مساوات کا پیغام سنانے لگے... جین مذہب والے بڑے قدامت پسند ہیں مگر سترہویں صدی کے آخر میں لرنکا شاہ نے ایک نئے فرقے کی بنیاد ڈالی جو استھانک وسی کہلاتا ہے اور جس نے مندر اور مورت دونوں کو خیرباد کہہ دیا۔ ... مگر جو فرقے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں وہ رامانند، کبیر، اور نانک جیسے جہاں گرد فقرا اور کلاونتوں کی بدولت جاری ہوئے... سکھوں کا وجود اسلام کے غیر ارادی مگر مہتم بالشان کارناموں میں سے ہے وشنو پرستی کے اس عام پسند مذہب نے جس کے علمبردار بنگال میں چیتن اور متھرا میں ولبھ چاریہ تھے غریب طبقے کی بڑی حمایت کی... ہندوستان کے شاعر اعظم تلسی داس نے رام بھگتی کا جو مسلک قائم کیا وہ بدقسمتی سے بہت ہی فلسفیانہ اور عملاً دشوار تھا... کرشن بھگتی نسبتاً زیادہ ہر دلعزیز اور لوگوں کی طبعی آرام پسندی کے مناسب حال ثابت ہوئی... اس سلسلے میں آریہ سماج کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جس کا وجود ہندو قوم کے تنزل اور اسلام کی طبعی قوت کا رہین منت ہے..."

"اسلام کے آتے ہی قدیم ادبیات کا زوال شروع ہو گیا اور صوبجاتی زبانیں... صف اول میں آگئیں مسلم بادشاہ اکثر علم نواز ہوتے تھے... سنسکرت کے چند مقبول شاہکار، بالخصوص قصص عربوں ہی کی وساطت سے بیرونی دنیا تک پہنچے... سیاسی اقتدار کے دوش بدوش عربوں کی زبان بھی کسب علوم کا بین الاقوامی ذریعہ بن گئی... ہندوستان کے پاس جو سرمایۂ علم تھا وہ عربی مصنفوں کی کاوش سے مہذب دنیا کو دستیاب ہوا۔ ہندی ادبیات اور علوم میں انھوں نے جو اضافہ کیا وہ ایک جداگانہ چیز ہے... مسلمان بادشاہوں کے فیض ہی سے رامائن، مہابھارت اور پران عوام تک پہونچے... امیر خسرو کو جدید ہندی کا بانی سمجھا جاتا ہے... عبدالرحیم خانخاناں

ہندی ادب کے چھ مشاہیر اعظم میں سے ہیں. جاہل کسانوں کو بھی رحیم کے دوہے یاد ہیں۔ رحیم کا کوئی ہمسر نظر آتا ہے تو غیر فانی تلسی داس جو رحیم کا ہمعصر اور دوست ہے کبیر کی نسبت آپ کیا کہینگے. اس پر ہندو اور مسلمان دونوں کو دعویٰ ہے... کرشن بھگت فرقے میں مسلمان بھی شامل تھے جن میں رس خان سب سے زیادہ مشہور ہے۔ پھر عالم او راس کی قابل بی بی شیخ رنگریزن بھی قابل ذکر ہے۔ یہ سب کے سب بہترین برج بھاشا لکھتے تھے۔ ..."

"مسلمانوں کی علمی ذہنیت نے ادبیات میں تاریخ اور سیرت نگاری کا اضافہ کیا... جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے تقریبًا مفقود تھی... بابر اور جہانگیر کی تزکیں دنیا کی بہترین سوانحمریاں ہیں. میری تمنا یہ ہے کہ کلیتًا نہیں تو جزواً ہی تاریخ ہند کسی طرح ایسی دلچسپ بنجاتی جیسے بابر، گلبدن بیگم اور جہانگیر کی دلآویز تحریریں..."

خوراک لباس اور خانہ داری کے سامان بھی بدل گئے، چینی کے برتن اور قالین استعمال ہونے لگے مسلمانوں کو دنیوی نعمتوں سے نفرت نہ تھی... اسلام جہاں پہنچتا تھا شوکت شائستگی اور آسائی کے اسباب مہیا کرتا تھا کیونکہ مسلمان بالطبع مدنیت پسند ہوتے ہیں۔

مسلمانوں نے ہندوستانی موسیقی میں جو ترقیاں کیں ان میں بھی یہی زبردست عقل سلیم کارفرما نظر آتی ہے... ہندوستان کی پیچیدہ بین کو دیکھکر ایک اور آسان اور خوبصورت ساز ستار ایجاد کیا گیا. سرود اور دلربا عہد اسلام میں رائج ہوئے ہندو کے استغراق اور محویت میں مسلمان کی طبعی خرمی اور لذائذ حیات سے لطف اندوزی اضافہ ہوگئی۔ خیال اور ٹھمری جیسے فرحت افزا راگ ایجاد ہوئے کیونکہ گردوپیش کے موجودہ حالات سے دلچسپی لینا اور اُن کو اپنی مخصوص نوعیت کے مطابق نئی صورت دیدینا اسلام کا کمال ہے..."

ابھی تک اسلام کے اثرات کا ذکر بحوالہ ماضی کیا گیا ہے۔ اب مستقبل کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ روحانی قوت جس نے معمولی ہاتھ پاؤں کے انسان کو ہمت آفرین اور جا بنا دیا تھا عصر حاضر میں بھی کارہائے عظیم ظہور میں لاسکتی ہے اسلام کی تعلیم کسی مخصوص جماعت کی

ملکیت نہیں۔ ساری دنیا اس کی مشترکہ وارث ہے۔ ہندوستان میں اسلام کی کامیابیوں سے صرف مسلمانوں ہی کو تعلق نہیں بلکہ ساری ہندوستانی قوم کو اس پر فخر ہو سکتا ہے۔"

ترکوں کا جنونِ مغربیت

معاصرِ اسلام لاہور میں ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب نے پروفیسر بیکر کی کتاب مشرق قریب و اقصیٰ کے تعلیمی مسائل پر تبصرہ کرتے ہوئے تیسرے لیکچر سے مصنف کے بعض خیالات پیش کئے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ مفکرین مغرب کے نزدیک ترکوں کا جذبۂ تقلید کیا اہمیت رکھتا ہے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:۔

"پروفیسر بیکر کا خیال ہے کہ جدید تعلیم کی اشاعت سے اسلام کی انفرادیت پر سخت ضرب لگی ہے اور ڈر ہے کہ کہیں اس کا وجود ہی ختم نہ ہو جائے۔ مثال کے طور پر ترکوں کو لیجئے۔ ان کے نزدیک کسی قوم کے احیا و تجدید کا یہ مطلب ہے کہ جہاں تک ہو سکے دوسروں کی تقلید جاری رہے۔ گویا محض کسی شکل کا اختیار کر لینا فی الواقعہ اس چیز کو پیدا کر لینا ہے جس کا اس سے اظہار ہوتا ہے۔ ترکوں نے صرف لباس ہی میں نہیں بلکہ سیاست و معیشت میں بھی یورپ کی تقلید کی ہے۔ ان کا ذہن اور ان کی ذہنیت بھی اس سے محفوظ نہیں رہی۔ وہ اہل فرنگ سے بڑھکر فرنگی بننے کا شوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے قومی ادب کے مطالعہ، نسلی تاریخ کی تدوین اور جملہ دینی ادارات کی تنسیخ سے ان تمام رشتوں کو توڑ ڈالا ہے جو ماضی سے قائم تھے ... آخری تبدیلی رسم الخط کی ہے۔ یہ نہیں کہ لاطینی حروف ترکی اصوات کے لئے عربی سے زیادہ موزوں ہیں مقصد صرف یہ تھا کہ ترکی اور یورپ کے ایک ہونے پر زور دیا جائے۔ ایسے ہی انھوں نے اسلامی قانون کی بجائے سوئیس دستور کو اختیار کیا۔ حالانکہ یہ قدیم جرمانک منروریات پر مبنی ہے۔ ترک اس بات کو نہیں سمجھتے کہ زواج و وراثت اور امور خانہ داری میں اسلامی

روایات سے الگ ہو کر ان کا رشتہ تاریخی اور جماعتی دونوں حیثیتوں میں اسلام سے منقطع ہو گیا ہے۔"

کچھ لارنس کے متعلق

لِونگ ایج (نیویارک) نے مانچسٹر گارڈین سے ایل، بی نامیئر کا ایک مضمون نقل کیا ہے جس کا عنوان ہے "لارنس ایک دوست کی حیثیت میں" اس مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ لارنس صیہونیت کا زبردست حامی تھا۔ جولائی ۱۹۳۰ء میں جب وہ نامیئر سے ملا ہے تو اس نے ان لوگوں کی سخت مخالفت کی جو عربوں کو یہودیوں کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے الفاظ تھے:۔

"صیہونیت کا مسئلہ تیسری پشت میں جا کر حل ہو گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس وقت جو لوگ فلسطین میں آباد ہو رہے ہیں اُن کی اولاد اس میں کامیاب ہوتی ہے یا ناکام۔ میری رائے میں اُن کی کامیابی بہت کچھ ممکن ہے۔۔ میں یہ سب کچھ اس لئے نہیں کہتا کہ مجھے یہود کی طرفداری منظور ہے بلکہ اس لئے کہ اگر اس طرح فلسطین نے از سرِ نو زندگی حاصل کر لی تو اس سے مشرقِ قریب کا مادی اور اخلاقی معیار بلند ہو جائیگا۔"

۱۹۲۱ء کی اس کانفرنس کے متعلق جو قاہرہ میں منعقد ہوئی اور جس میں شرق اردن کو فلسطین سے الگ کر دیا گیا لارنس نے مضمون نگار کو بتلایا کہ اس کانفرنس کے فیصلے لندن میں طیار ہو چکے تھے قرار دادیہ تھی کہ شرق اردن فلسطین ہی میں شامل رہے گا۔ لیکن جب قاہرہ میں کانفرنس کا انعقاد ہوا تو اور سب فیصلے تو ویسے ہی رہے۔ البتہ شرق اردن کو فلسطین سے الگ کر دیا گیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت امیر عبداللہ حجاز سے شرق اردن کی طرف بڑھ رہا تھا تاکہ شام میں فرانسیسیوں پر حملہ کرے۔ لیکن اگر امیر عبداللہ کو اس اقدام سے روکا نہ جاتا تو شرق اردن فرانس کے قبضے میں آجاتا کیونکہ فرانسیسی افواج یہاں اپنا جنگی محاذ قائم کرتیں۔ لہذا ہمارے سامنے دو راستے تھے۔ اول یہ کہ شرق اردن میں ایک انگریزی دستہ متعین کیا جاتا۔ لیکن برطانوی کابینہ

اس کے لئے طیار نہیں تھا۔ لہذا اس مسئلے کا بہترین حل یہ تھا کہ کیوں نہ اس علاقے کو ایک برطانوی عبداللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

مضمون نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن سعود کے متعلق لارنس کی رائے یہ تھی کہ وہ بہت بڑے آدمی ہیں لیکن کسی نتیجہ نا تخیل سے عاری۔ اتحاد اسلام کے خطرے کو بھی وہ کوئی وقعت نہیں دیا کرتا تھا۔ عرب میں اس نے جو کام کیا پیچھے رہ کر کیا۔ اس کی تمام تجاویز امیر فیصل کے ذریعے پوری ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ ایک عربی قبیلہ نے فیصل کو پیغام بھیجا کہ وہ ایک فوجی ٹرین کو لوٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جس کے لئے ایک ریلوے پل کا اڑانا ضروری ہوگا۔ لہذا اسے چاہئے کہ فوراً ایک "لارنس" بھیجدے۔ ان کا خیال تھا کہ لارنس کسی جنگی آلے کا نام ہے!۔

اسلام برازیل میں

مصری مجلہ الرسالہ اس خبر کا ذمہ دار ہے کہ سینٹ پال کی عربی نو آبادی میں اسلامیان برازیل نے ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کو ایک جمعیت قائم کی ہے جس کے صدر محمد احمد الطواف مقرر ہوئے ہیں۔ اس جمعیت کا مقصد مسلمانوں کے اندر دینی حرکت پیدا کرنا ہے۔ اس غرض سے ایک مدرسہ بھی قائم کیا جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دلچسپی سے سنی جائیگی کہ جامعہ پرنس ٹن (امریکہ) میں ادب عربی اور اسلامی علوم کے مطالعہ کے لئے ایک شعبہ قائم کیا گیا ہے اور سردست پروفیسر ہٹی اس کے صدر مقرر ہوئے ہیں۔

دیارِ اسلام میں مسیحی سرگرمیاں

مسلم ورلڈ کے ایک مبلغ نامہ نگار کو جو اس وقت سماٹرا میں مقیم ہے اسلام سے شکوہ ہے کہ اس کی غیر معمولی قوت اور اثر کی وجہ سے وہاں مسیحی تبلیغ کا دائرہ تنگ ہو رہا ہے۔ نامہ نگار کا خیال ہے

کہ تحریک محمدیہ کی ابتدا سے پہلے سماٹرا میں عیسائیت کی تبلیغ ایک آسان سی بات تھی۔ لیکن اب یہ مسلمان اس تحریک میں شامل ہو چکے ہیں۔ ان کے اندر اصلاح اور تبلیغ اسلام کا زبردست جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ عیسائیت کے بطلان سے اُن کو خاص دلچسپی ہے۔ علماء اور مبلغین ہر جگہ سرگرم کار ہیں۔ عیسائیوں کو دعوت مناظرہ دیتے ہیں اور ان کے خلاف بہت سا روپیہ صرف کر رہے ہیں۔

نامہ نگار کا خیال ہے کہ اہل سماٹرا محض ذاتی مفاد کے خیال سے مسلمان ہوتے ہیں۔ اس نے سماٹرا کے مختلف حصوں میں اسلام اور عیسائیت کی تبلیغی کوششوں کا حال مختصراً بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمان عیسائیوں پر تشدد کرتے ہیں مبشرین کو ہر جگہ دق کیا جاتا ہے۔ بایں ہمہ لوگ دل سے مسلمان نہیں ہوتے۔ غلبہ عیسائیت ہی کو ہوگا۔

پادری صاحب کی خوش فہمی قابل داد ہے۔ بہرکیف سماٹرا کے بعد شمالی افریقہ کا رُخ کیجئے۔ تونس، الجزائر اور قسطنطین میں اس وقت چھ "مسیحی بیت" قائم ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنے یہاں صنعت و دستکاری سکھانے کے بہانے لے آتے ہیں۔ غریب ماں باپ اصل حالات سے ناواقف اپنے بچوں کو تعلیم کے لالچ میں ان کے سپرد کر دیتے ہیں کارکنان "بیت" ان کو صنعت و دستکاری کے ساتھ عیسائیت کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ الجزائر اور تونس میں اس قسم کے مسیحی "بیوت" کا حلقہ وسیع ہو رہا ہے اور یہ مبشرین کے نزدیک اشاعت مذہب کا نہایت عمدہ ذریعہ ہے اس لئے کہ اس طرح اکثر بچے بڑے پُرجوش عیسائی بن گئے ہیں۔ بایں ہمہ ایچ۔ ڈگلس نامہ نگار مسلم ورلڈ کا خیال ہے کہ ان کے تربیت یافتہ لڑکے یا تو مذہب سے بیگانہ ہو جاتے ہیں یا عیسائیوں پر لعنت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے والدین بھی ان بیوت کے اصلی مقصد سے واقف ہو گئے ہیں اور بالعموم جو لڑکے ان میں داخل ہوتے ہیں وہ مسلمان ہی رہتے ہیں۔

تنقید کتب

۱۔ شاہ نامہ اسلام

مجلدات اول و دوم قیمت ملنے کا پتہ: شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

حفیظ کا نام اب اردو شاعری میں محتاج تعارف نہیں اور یہی کیفیت شاہ نامہ اسلام کی ہے جس کے اشعار بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ قبولیت عام کی یہ ایک ایسی مثال ہے جس پر غالباً شاعر کو بھی ناز ہوگا۔

شاہنامہ اسلام غزوات نبی صلعم اور ملت کی ابتدائی تاریخ کا منظوم بیان ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ گذشتہ تیرہ صدیوں میں اسلامی ادب نے بہادران اسلام کے حیرت انگیز کارناموں سے مطلق اعتنا نہیں کیا۔ ان کی توجہ زیادہ تر رستم و اسکندر کے جنگی معرکوں پر رہی یا پھر فرہاد و شیرین اور مجنون و لیلیٰ کی عشقیہ حکایات کے پردے میں نکاتِ تصوف کا اظہار ہوتا رہا۔ الاماشاء اللہ۔ غازیان اسلام اور مجاہدین حق کے تذکرے سے شعر و شاعری کی محفل بہرحال خالی رہی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مسلمانوں کی ذلت اور غلامی کا دور حال ہی میں شروع ہوا ہے اور اپنے عروج و اقبال کے زمانے میں انھیں اسلامی فتوحات کے "افسانے" نہ افسانے معلوم ہوتے ہوں نہ ان کا نظم کرنا انہیں جوش اور ولولہ انگیزی کے لئے ضروری نظر آتا ہو۔ حقیقت کچھ بھی ہو اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرح ہمارا ادب اسلامی تاریخ کی اس مخصوص روح سے محروم رہا جس کی آج دنیا کو شدید ضرورت ہے اور جس کو ہم اپنے زوال و نکبت کی وجہ سے فراموش کر چکے تھے۔ حفیظ کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس کے کمال شاعری کی بدولت وہ محفلیں جہاں صرف ہیر و رانجھا اور نل دمن کی خیالی روایات کا چرچا رہتا تھا اب فاروق اعظمؓ اور شیر خداؓ کی

جانبازیوں پر وجد کرتی ہیں۔ شاہنامہ اسلام مسلمان بچوں اور بچیوں کے اندر شعور ملی پیدا کرنے کا ایک کامیاب ذریعہ ہے اور ہمیں یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ مسلمانان ہند اس بہت بڑی خدمت کے لئے بجا طور پر حفیظ کی قدر کر رہے ہیں۔

البتہ یہاں ایک غلط فہمی کو رفع کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ نقادان سخن جب شاہنامہ پر نقد کرنے بیٹھتے ہیں تو معلوم نہیں کیوں اسے "ایپک" کی حیثیت سے دیکھتے ہیں ایک لحاظ سے شاہنامہ ضرور ایک "ایپک" (رزمیہ) ہے لیکن حفیظ "رزم گو" شاعر نہیں۔ بیشک وہ مسلمانوں کے دل میں اسلام کے ابتدائی کارناموں کی یاد تازہ کر کے ان کے جذبات کو اُبھارنا چاہتے ہیں لیکن انھوں نے شروع ہی سے کتاب کی ترتیب ایسی رکھی ہے کہ واقعات کا تسلسل اور ان کی تاریخی نوعیت قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہنامہ اسلام میں حفیظ کا اصلی رنگ یعنی الفاظ و اصوات کا ترنم موجود نہیں مگر یہ اس لئے نہیں کہ شاعر اب اس ترنم پر قادر نہیں رہا معلوم ہوتا ہے مصنف کا قلم فرط ادب سے رُک گیا ہے —— مصنف نے اپنے جوش عقیدت کا اظہار دوسرے موقعوں پر کیا ہے۔

بایں ہمہ شاہنامہ اسلام حفیظ کے زور بیان اور سلاست و روانی کا نہایت اچھا نمونہ ہے۔ تاریخ کو تاریخ کی حیثیت میں نظم کرنا ایک نہایت ہی مشکل کام تھا جس سے مصنف بڑی کامیابی کے ساتھ عہدہ برا ہوا ہے۔ آج کل ہندوستان میں شعراء کی کمی نہیں جو الفاظ و تراکیب کے سحر سے ایسی ایسی نکتہ آفرینیاں کرتے رہتے ہیں کہ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو معانی و مطلب کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس چیز کا نام اہل فن نے آرٹ رکھا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ حفیظ کی طبیعت اس آرٹ سے متاثر نہیں ہوئی۔ ان کا موضوع شاعری حقیقی بھی ہے اور واضح بھی اور گو صدیوں کی پُرآب مگر خیالی از معنے زبان آوری کے سامنے انکا رنگ سخن پھیکا ہو مگر اس کے اکثر حصے کمال فن کا نہایت اچھا نمونہ ہیں۔ مثلاً مجلد اول میں سلام اور مجلد ثانی میں صحرا کی دعا۔ لیکن چونکہ یہ اور اس قسم کے دوسرے قطعات تقریباً ہر شخص کی زبان پر ہیں اس لئے تنقید نگار کے لئے اُن کا اعادہ ضروری نہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہندوستان کا کوئی مسلمان گھر شاہنامے سے خالی نہیں رہے گا۔

مدیر

۲۔ ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش

مجموعۂ خطبات خالدہ ادیب خانم

قیمت دو روپے، ضخامت ۲۸۸ صفحات، مکتبہ جامعہ، قرول باغ، دہلی

بالآخر مشہور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کے ان خطبات کا اُردو ترجمہ شائع ہو گیا جو انھوں نے اس سال جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دعوت پر ارشاد فرمائے تھے۔ خاتون موصوف کے خطبات کی کل تعداد آٹھ ہے جن کے شروع میں ڈاکٹر مختار احمد صاحب امیر جامعہ کا ایک مختصر سا دیباچہ ہے۔ کتاب کا موضوع "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ہے" لیکن اس سے بجز ایک سیاسی کشمکش کے اور کسی آویزش کا پتہ نہیں چلتا۔ تمدنی اعتبار سے دیکھا جائے تو صرف یہی ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ ترک یا تو اسلامی تہذیب کا صحیح مدعا سمجھنے سے قاصر تھے۔ یا انھوں نے دانستہ مغرب کی اندھا دھند تقلید پہ کمر باندھ رکھی ہے۔ اس لحاظ سے مشرق و مغرب کی یہ نام نہاد آویزش کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ بیشک خالدہ خانم ایک محب وطن خاتون ہیں اور اُن کو اپنی قوم کی عزت اور نام آوری کا ہر وقت پاس رہتا ہے جہاں تک ترکوں کے جوہر شرافت اور شجاعت اور مردانگی کا تعلق ہے اس بات میں ہم بھی ان سے متفق ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ترکوں کے ذہنی تغیر کی وہ تعبیر کی جائے جو کسی طرح صحیح نہیں خالدہ ادیب خانم ایک ہوشیار مقررہ ہیں اور صحافت و خطابت کے داؤ و پیچ کو خوب سمجھتی ہیں مگر اس کے باوجود انھیں اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی اور وہ نہیں سمجھیں کہ بطور ایک پیام اور اجتماعی تحریک کے اسلام کی اہمیت کیا ہے۔ دوران تقریر میں جب کبھی وہ ریاست اور مسجد کی علیحدگی کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانان ہند کو مشورہ دیا کرتی تھیں کہ انہیں ہندوستانی قومیت (نیشن ہڈ) کی تعمیر میں سیاست کو مسجد سے الگ تصور کرنا چاہیئے یا یہ کہ نیشنلزم (وطنیت) اور چیز ہے اور نیشن ہڈ (قومیت) اور تو ہمیں ان کے الفاظ پر حیرت ہوا کرتی تھی کہ کس طرح وہ تاریخی

اور اصولی دونوں پہلوؤں سے اسلامی تہذیب کے مدعا و مقاصد سے ناواقف ہیں اور پھر اس کے ساتھ ہی جب وہ ترکیب و امتزاج (ائتلاف۔Synthesis) پر زور دیتی تھیں تو ان کے غیر واضح اور باہم متناقض خیالات پر تعجب ہوتا تھا۔ ائتلاف یا ہمارے لائق اور مکرم دوست ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے الفاظ میں جنھوں نے اس کتاب کا ترجمہ فرمایا ہے ترکیب و امتزاج ایک اصول وحدت ہے جو کسی مفاہمت یا دوئی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اسلام خالصتاً توحید ہے اور اس میں اس قسم کے افتراق و تقسیم کی مطلق گنجائش نہیں اسلام مسجد بھی ہے اور سیاست بھی اور مسلمانان ہند اپنے استحکام کے لئے کسی ایسی قومیت کے محتاج نہیں جو مذہب سے بے نیاز ہو اگر خالدہ ادیب خانم اس نکتے کو سمجھ لیتیں تو کبھی مسلمانوں کو یہ مشورہ نہ دیتیں کہ اصلاح دیہات کے پروگرام میں مسلمانوں کو گاندھی جی کے ساتھ شریک ہوجانا چاہئے یا یہ کہ اچھوت سدھار میں ان کی امداد کریں - ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اصلاح دیہات ہی کے ضمن میں مسلمانوں کی ملی ضروریات بلکہ انکی دینی روح گاندھی جی کی حکمت و معرفت سے قطعاً مختلف ہے اور کوئی سمجھدار مسلمان اچھوت سدھار کے فریب سے مطمئن نہیں ہوسکتا۔ علی ہذا ان کا یہ ارشاد نہایت عجیب و غریب ہے کہ میری ناچیز رائے میں ان کی ذات (یعنی گاندھی جی) جدید اسلام کا ایک مکمل نمونہ ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ جب ایک دفعہ انسان کے ہاتھ سے رشد و ہدایت کا دامن چھوٹ جاتا ہے تو وہ کیسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے خانم اسلام اور اسلامی تعلیمات سے بالکل بے خبر ہیں اور اس سلسلے میں جس تھوڑی بہت واقفیت کا اظہار انھوں نے کیا ہے وہ چند سنی اور لکھی ہوئی باتوں یا بعض مستشرقین کی فرسودہ معلومات تک محدود ہے۔ ان کا ذہن نبوت کی عظمت و بلندی کا اندازہ کرنے سے قاصر رہا۔ نبوت محض تقدس کا مرادف نہیں کہ اگر گاندھی جی نے رسول پاک صلعم کی صداقت کا اعتراف کرلیا تو گویا اس سے رسالت محمدیہ کی تصدیق ہوگئی تصدیق رسالت کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم صاحب رسالت کی بتائے ہوئے راستے یعنی احکام قرآنی پر چلیں ظاہر ہے کہ گاندھی جی کا نہ کبھی یہ مقصود تھا۔

کریں۔ نبوت ایک سیاسی اور اجتماعی ادارہ بھی ہے جس سے ایک نئی اخلاقی فضا کی تخلیق ہوتی ہے اور اس اخلاقی فضا میں پرورش حاصل کئے بغیر افراد کمالات زندگی سے محروم رہتے ہیں۔ لہذا جو شخص نبوت کا انکار کرتا ہے وہ کافر ہے اور گاندھی جی کو تو نہ صرف رسالت محمدیہ کا انکار بلکہ یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ ایک نئی اخلاقی فضا کے موجد ہیں۔ تعجب ہے امیر جامعہ نے خالدہ ادیب کو اس غلط فہمی پر کیوں متنبہ نہیں کیا۔ یہ ایک مثال ہے ان افسوسناک نتائج کی جو انھوں نے مشرق و مغرب کی اس مزعومہ کشمکش سے اخذ کئے ہیں جو بقول ان کے ترکی میں جاری تھی۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ خطبات کی ترتیب سے پہلے وہ اپنے ذہن میں چند مقدمات قائم کر چکی تھیں جن کو باوجود ان کی تغلیط و تردید کے انھوں نے آخر وقت تک نہ چھوڑا۔ مشرق و مغرب کی تفریق کے متعلق جب علامہ اقبال نے ان کے خیالات کی تصحیح کی ہے تو اس امر کو تسلیم کرنے کے باوجود کہ اسلام میں روح و مادہ کا ائتلاف ہو چکا ہے انھوں نے مشرق و مغرب کے ماضی و حال کی تعبیر اسی خیال کے ماتحت کی جس کو وہ شروع میں بیان کر چکی تھیں۔ بہرکیف یہاں اس مسئلے سے بحث نہیں کہ اسلام کے ماضی و مستقبل کو کس نہج پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ ہماری محترم بہن کو نہ صرف اس مسئلہ کی اہمیت کا احساس ہوا۔ بلکہ وہ علامہ اقبال کی تنبیہات کا مطلب بھی سمجھنے نہیں پائیں۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے "جس طرح مغرب میں قوانین فطرت دریافت کئے جاتے ہیں . . . اسیطرح روحانی قوانین دریافت کیے جائیں تو ان کی کنجی ہندو ذہن کے ہاتھ میں ہے" اور کہتی ہیں کہ کم از کم اس بات میں سر محمد اقبال بھی مجھسے اتفاق کرینگے۔ اس لئے کہ وہ خود فرماتے ہیں کہ قدیم ہند کے خیالات کی پوری عمارت روح مجرد کے تصور پر قائم کی گئی تھی" حالانکہ سر محمد اقبال نے جو کچھ کہا تھا وہ صرف یہ تھا۔ کہ قدیم ہندو خیالات کی عمارت مجرد روح کے تصور پر قائم ہے یہ نہیں کہا تھا کہ ہندو ذہن روحانی خیالات کی کنجی ہے ان دونوں قضایا میں جو فرق ہے اُس کو منطق کا ایک معمولی طالب علم بھی سمجھ سکتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ خالدہ خانم اسلام کی ائتلافی قدر و قیمت کا اعتراف کرنے کے باوجود تذبذب میں

ہیں کہ آیا ترکوں کی طرح مادی زندگی میں مغربی تنظیم اور طریق عمل اختیار کیا جائے یا اس نام نہاد امتزاج کو جو ہندوستان میں مادیت و روحانیت کے درمیان ہو رہا ہے اس سے بھی عجیب تر ان کے وہ خیالات ہیں جو انھوں نے اتحاد اسلامی کے متعلق ظاہر کئے ہیں یا جہاں اپنی اس رائے کی تائید میں کہ مشرق کی نظر روحانیت پر ہے انھوں نے ڈاکٹر بھگوان داس کی کتاب سے ایک صوفی کا قول اور اپنیشدہ اور گیتا کے ایک ایک اقتباس کے ساتھ قرآن مجید کی چند آیات نقل کی ہیں مثلاً یہ کہ "یہ پہلے صحف میں ہے" یا یہ کہ "ہم انبیا میں تفریق نہیں کرتے"۔ تقریباً یہی کیفیت اس دیباچے کی ہے جسے ڈاکٹر انصاری صاحب نے رقم فرمایا ہے اور جس کے اکثر حصوں میں انھوں نے ایک جدید معاشرت اور قدیم تہذیب کا ذکر کچھ ایسے مبہم الفاظ میں کیا ہے جن سے پتہ نہیں چلتا کہ اُن کا مافی الضمیر کیا ہے۔ خالدہ ادیب خانم کے تمام خیالات کی تائید کرتے ہوئے وہ آخر میں لکھتے ہیں "ہمیں چاہیے کہ خالدہ خانم اپنی قوم کی مذہبی روح کے متعلق جو کچھ کہتی ہیں اسے تسلیم کرلیں"۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے اختلاف کرنا پڑتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان کا عذر یہ ہے کہ خالدہ خانم نے مذہب سے معروضی انداز میں بحث کی ہے۔ بہت بہتر لیکن خالدہ خانم آخر مسلمان ہیں اور یہ خطبات بھی ایک اسلامی جامعہ کے لئے طیار کئے گئے تھے اس لئے ان کے معروضی انداز کے باوجود اسلام کی صریح وصاف اور مبین تعلیمات سے کیونکر انکار کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے لئے تو اصلاح و تجدد کا وہی ایک معیار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک ایسی درسگاہ کے نگران ہیں جو اسلامی تعلیم و تمدن کے احیا کا دعویٰ رکھتی ہے۔ لہذا ان کو اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے کہ خالص "معروضی" انداز تنقید کس قدر خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ الفاظ و نظریات کا ایک عجیب طلسم ہے کہ اس کے ماتحت مسلمات شریعت کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی۔ بہرکیف ڈاکٹر صاحب کی طرح ہم بھی خالدہ ادیب خانم کی ذہانت و لیاقت اور ان کی غیر معمولی صفات کے معترف ہیں اور اگر ہم نے ان کے خیالات سے اختلاف کیا ہے تو محض اس لئے کہ ان کے خطبات شروع سے لیکر آخر تک

تنقید طلب ہیں۔ ہمیں یہ دیکھکر رنج ہوتا ہے کہ ہماری یہ نہایت ہی محترم اور معزز ذہن چند مغالطوں کا شکار ہوگئے ہیں ۔ ان کی ذات ہمارے لئے غیر معمولی شرف اور عزت کا باعث ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ہمارے ترک بھائیوں میں وہ خوشگوار ردعمل شروع ہوگا جس کے ہم سب دل سے متمنی ہیں۔ امید ہے کہ اسلامی ہند میں ان خطبات کا مطالعہ خاص دلچسپی سے کیا جائیگا۔ ترجمے کی خوبی اور انداز بیان کی لطافت کے لئے ڈاکٹر سید عابد حسین کا نام ہی ضمانت ہے۔ البتہ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ انھوں نے سلطنت کی بجائے سامراج اور جماعت کے لئے سماج کی اصطلاحیں کیوں استعمال کی ہیں۔ لیکن یہ ایک مستقل بحث ہے جس کے متعلق پھر کبھی انشاءاللہ

مدیر

بقیہ صفحہ ۹۵

غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جان پاک را
حکمتے کو عقدۂ اشیا کشاد — با تو غیر از فکر چنگیزی نداد

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اقبال کی شاعری اور ان کا فلسفہ محض قرآن پاک پر مبنی ہے اور اگر آج نوجوان مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا ہوگیا ہے کہ اپنے دین مقدس کی شاندار روایات پر فخر کریں تو صرف ان کے معرفت زا نغموں اور ناقابل انکار اسلامی حکمت و دانش کی بدولت

راجہ حسن اختر بی اے

مراسلات

"لائٹ" کا عجز فہم

ہمیں راجہ حسن اختر صاحب بی-اے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر پنجاب کی طرف سے علامہ اقبال مدظلہ کے اس بیان کے سلسلے میں جو انھوں نے کچھ عرصہ ہوا تحریک قادیان کے متعلق دیا تھا ایک طویل مراسلہ بغرض اشاعت موصول ہوا ہے جس کو ہم دلی شکریہ کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب لائٹ نے راجہ صاحب کی فہمائش کے باوجود علامہ اقبال کے خیالات کے متعلق جس غلط بیانی سے کام لیا ہے اُس کی تردید کسی دوسری جگہ کی گئی ہے —— مدیر

کچھ دن ہوئے مجھے "لائٹ" کے وہ دونوں مضمون دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا جو ڈاکٹر سر محمد اقبال کے ان خیالات کے متعلق جنکو ختم رسالت پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے اپنے ایک بیان میں ظاہر کیا تھا یکے بعد دیگرے شائع ہو چکے ہیں۔ مدیر لائٹ کو اگرچہ مسئلہ ختم نبوت میں ڈاکٹر صاحب سے اتفاق ہے لیکن ان کے بعض الفاظ کا جو مطلب انھوں نے سمجھا ہے اس میں وہ قطعی حق بجانب نہ تھے۔ مدیر لائٹ کہتے ہیں کہ شاعر کا مزاج اس قدر اسلامی نہیں جتنا کہ مغربی اور ان کے نزدیک ڈاکٹر صاحب کا شمار ان بڑے بڑے مفکرین میں ہونا چاہئے جو اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ خدا کسی انسان سے ہمکلام ہو سکتا ہے۔ اگرچہ جریدۂ ٹروتھ لاہور کے ایڈیٹر سے اس امر کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ظاہر فرما دیا تھا کہ وحی باللفظ کے متعلق ان کی رائے کیا ہے اور اس سے تمام غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا تھا بایں ہمہ مدیر لائٹ نے اس کا مطلق خیال نہیں کیا اور ایک تیسرے مضمون میں بھی انہی باتوں کا اعادہ کیا جنکو وہ اس سے پہلے لکھ چکے تھے۔

علیٰ ہذا انھوں نے لفظ "نجات یافتہ" کا بھی جس کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے بیان میں استعمال کیا تھا مطلب نہیں سمجھا اور اس سلسلے میں ایسے ایسے استدلالات سے کام لیتے رہے جنکی مطلق ضرورت نہ تھی۔ جن لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کا کلام پڑھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ان کے نزدیک اسلام بجائے خود نجات کا مظہر ہے۔ اس نے اسوقت جب دُنیا "عسر" کی حالت میں تھی "یُسر" کا پیغام دیا۔ انسان نے اپنے عمل اور فکر کی دنیا میں ایک نہیں سینکڑوں اور ہزاروں دائرے قائم کر رکھے تھے۔ اسلام نے ان کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت دی۔ یہ صراط مستقیم کا تخیل دنیا کی مذہبی تاریخ میں نرالا ہے۔ اس کا مطلب حق کی ایک دنیا کے بعد بالالتزام اس کے دوسرے عوالم کی طرف بڑھنا ہے اور یہ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ انسان کو ایک آزاد اور "نجات یافتہ" زندگی حاصل ہو۔ گویا دینی اعتبار سے شاعر کا مقصد یہ ہے کہ ہم شیطان کی جملہ تلبیسات سے آزاد ہو سکیں۔ برعکس اس کے مدیر لائٹ کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان خدا اور خدا کے بھیجے ہوئے دین سے آزاد ہو جائے۔ یہ ایک نہایت ہی خوفناک اتہام ہے ایک ایسے شخص پر جو خدا پر ایمان رکھتا ہے جس نے ایک دفعہ پھر اسلام کو ہم پر منکشف کیا اور کوشش کی ہے کہ جدید دنیا کیلئے فکر اسلامی کو از سرِ نو تشکیل دے۔

گوہر دریائے قرآں سفتہ ام	شرح رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام
با مسلمانان غمے بخشیدہ ام	کہنہ شاخے را نمے بخشیدہ ام
دارم اندر سینہ نور لا الہ	در شراب من سرور لا الہ
فکر من گردوں مسیر از فیض اوست	جوئے ساحل نا پذیر از فیض اوست

اس الزام کی تائید میں کہ ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کو یہ دعوت دی ہے کہ وہ دین کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں" مدیر لائٹ نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کی یہ عبارت پیش کی ہے۔

"معلوم ہوتا ہے پیغمبر اسلام صلعم دنیائے قدیم اور دنیائے جدید دونوں کے درمیان کھڑے ہیں۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ آپ کی وحی کا سرچشمہ کیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا تعلق دنیائے

قدیم سے ہے لیکن اگر اس بات پر نظر کی جائے کہ آپ کی وحی کا مطلب کیا ہے تو آپ کی ذات دنیائے جدید سے تعلق رکھتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بدولت علم کے ان نئے ذرائع کا انکشاف ہوا جن کی اب زندگی کو ضرورت تھی۔ اسلام کا ظہور استقرائی علم کا ظہور ہے اسلام نے ختم نبوت سے خود نبوت کی تکمیل کر دی ہے اس میں دقیق نکتہ مضمر ہے کہ زندگی کو ہمیشہ قیود کا پابند نہیں رکھا جا سکتا۔ شعور ذات کی تکمیل کے لئے ضروری تھا کہ انسان خود اپنی قوتوں پر بھروسہ کرے"

اس عبارت پر رائے زنی کرتے ہوئے ایڈیٹر صاحب لائٹ فرماتے ہیں کہ "تکمیل رسالت" کا یہ مطلب ہے کہ نبوت منسوخ ہو گئی اور چونکہ استقرائی علم کا ظہور ہو چکا ہے لہذا اب دینی "قیود" کی مطلق ضرورت نہیں۔ انسان کو چاہئے کہ وحی الٰہی سے فیضیاب ہونے کی بجائے "ذاتی قوتوں پر بھروسہ کرے" ڈاکٹر صاحب کے الفاظ کا یہ مطلب صرف مدیر لائٹ ہی کے ذہن میں آسکتا ہے ورنہ اس عبارت میں کوئی لفظ ایسا نہیں تھا جو اس غلط تاویل کا موجب ہوتا۔ اس کا سیدھا سادا مطلب صرف اس قدر ہے کہ پیغمبر اسلام صلعم کی ذات میں نبوت اپنے ارتقا کی آخری منزل طے کر چکی ہے لہذا اب سلسلۂ نبوت منقطع ہو گیا ہے۔ علیٰ ہذا قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری وحی ہے اور آئندہ کسی وحی کا امکان نہیں بالفاظ دیگر آنحضرت صلعم خاتم النبیین ہیں اور قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین ۰

تبارك الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعلمین نذیرا ۰

البتہ اس کا یہ مطلب کہ دینی واردات ہی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے غلط ہے ہاں اب انسان ان واردات کا پابند نہیں۔ ہمارے لئے جو چیز حجت ہے وہ صرف قرآن مجید ہے جو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے قرآن کے ہوتے ہوئے اب کسی شخص کو یہ حق نہیں رہا کہ وہ اپنی دینی واردات کو بطور حجت پیش کرے زیادہ سے زیادہ اب ان کا تعلق کسی شخص کی اپنی ذات سے ہو سکتا ہے۔

بازیاب ایں نکتہ را اے نکتہ رس   عشق مرداں ضبط احوال است و بس

اب ملت اسلام کا فرض ہے کہ ہر شخص کی قدر وقیمت کا اندازہ تعلیمات قرآنی کے ماتحت کرے کہ وہ کہاں تک منشائے الہٰی کو پورا کرتا ہے۔ اور کہاں تک اس بات کا اہل کہ حیات ملی اس سے مستفیض ہو سکے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی معاشرت انکی سیاست ومعیشت اور تمدنی مصالح کو سمجھتا ہو۔ اگر کسی شخص کی دینی واردات نے اس کے دماغ کو ماؤف کر رکھا ہے تو ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ اس سے اپنی بریت کا اظہار کرے بلکہ اگر مناسب ہو تو اسے کسی نفسیاتی معمل یا پاگل خانے میں بھیجدے۔ ہم اس امر کو برداشت نہیں کر سکتے کہ محض اشخاص کی خاطر اپنے مقصود ومنتہا کو بھول جائیں یا اس کو چند باطنی واردات کی لذت پر قربان کر دیں۔ ہمارے لئے صرف قرآن پاک اور اسوۂ رسول اللہ صلعم کا اتباع کافی ہے۔ کسی شخص کے خواب' اس کی پیشگوئیاں یا اس قسم کے دوسرے نفسیاتی مظاہر ہمارے لئے کوئی حجت نہیں رکھتے انہوں نے سادہ لوح مسلمانوں کے سامنے ایک افیمچیوں کی سی بہشت قائم کر رکھی ہے۔ یہ خوفناک امراض صدیوں سے امت پر مسلط رہے ہیں اور انھوں نے اسلامی تہذیب وتمدن کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ یہ انہی باتوں کا نتیجہ ہے کہ آج امت میں ایک نہیں ہزاروں اختلافات قائم ہیں۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے اگر ڈاکٹر اقبال یہ کہیں کہ ہمیں اپنی دینی واردات کو قرآن وسنت کی روشنی میں دیکھنا چاہئے اس لئے کہ ہم سوائے قرآن وسنت کے اور کسی چیز کو حجت نہیں سمجھتے تو مدیر لائٹ ان پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ سرے سے وحی کے منکر ہیں۔

پھر اگر ڈاکٹر صاحب نے یہ لکھا ہے کہ اسلام کا ظہور استقرائی علم کا ظہور ہے تو اس میں کیا قباحت ہے۔ استقرائی علم بھی تو اسلام ہی کا پیدا کردہ ہے اور جہاں تک احقاق حق کا تعلق ہے قرآن پاک ہی کی ہدایت اور دستگیری کا محتاج۔ البتہ علم کے حدود بھی ہیں۔

علم تفسیر جہان رنگ وبو   دیدۂ دل پرورش گیرد ازو
بر مقام جذب وشوق آرد ترا   باز چوں جبریل بگذارد ترا

علم جز شرح مقامات تو نیست　　　علم جز تفسیر آیات تو نیست
دل اگر بندد بحق پیغمبری است　　　ور ز حق بیگانہ گردد کافری ست

مدیر لائٹ نے اس فقرے کا مطلب بھی نہیں سمجھا کہ "شعور ذات کی تکمیل کے لئے ضروری تھا کہ انسان کو اس کی ذاتی قوتوں پر چھوڑ دیا جائے۔ گویا یہ قوتیں قرآن پاک سے آزاد ہیں حالانکہ ان کا انکشاف بھی قرآن مجید ہی کی بدولت ہوا ہے۔ ان کا انکار گویا قرآن پاک کا انکار ہے۔ اسلام دین فطرت ہے اور اس کی آواز کائنات کی آواز لہذا کائنات کا فائدہ بھی اسی میں ہے کہ اس پر اسلام کی حکومت ہو لیکن یہ اسیوقت ممکن ہے جب ہم ان تمام ذرائع سے کام لیں جو قرآن نے ہم پر آشکار کئے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ اس بحث کو سمجھنے کے لئے مدیر لائٹ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کے پانچویں خطبے کا مطالعہ کریں۔ قرآن خدا کا کلام ہے اور کائنات اُس کی سنت۔ دونوں کی ایک دوسرے سے تشریح ہوتی ہے اور ان میں کوئی نزاع ممکن نہیں۔

فقر قرآن اختلاط ذکر و فکر　　　فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر
جز بقرآن ضیغمی روباہی است　　　فقر قرآن اصل شاہنشاہی است

رو زہا شب ہا تپیدن می تواں　　　عصر دیگر آفریدن مے تواں
صد جہاں باقیست در قرآں ہنوز　　　اندر آیاتش یکے خود را بسوز

ایڈیٹر صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ شاعر کے مزاج پر مغربیت کا رنگ غالب ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ ممدوح مغربی سیاست اور مغربی فلسفہ کا نہایت گہرا علم رکھتے ہیں لیکن یہ انکے ارتقائے فہم کی راہ میں ایک ضروری مرحلہ تھا اور اس سے انکو اسلامی ثقافت کی تجدید و احیا میں امداد ہی ملی ہے اُنھوں نے کسی خوبی سے ان خرابیوں کو ظاہر کیا ہے جو مغرب کی کورانہ تقلید میں مضمر ہیں۔

حکمت اشیا فرنگی زاد نیست　　　اصل او جز لذت ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلمان زادہ است　　　ایں گہر از دست ما افتادہ است
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند　　　حاصلش افرنگیاں برداشتند　　صـ ۹۳

بزم طلوع اسلام

۱۔ علامہ اقبال اور ختم نبوت

آج سے چند ماہ پہلے جب علامہ اقبال مدظلہٗ نے احرار اور قادیان کی باہمی آویزش کے متعلق اپنا مشہور بیان شائع کیا ہے تو اس میں ختم نبوت کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ ندرت تخیل کے اعتبار سے اس عقیدے کی حیثیت بنی نوع انسان کے افکار اور تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے۔ اس پر قادیان اور قادیان کے علاوہ بعض مسلم اور غیر مسلم حلقوں میں جو رد و کد ہوتی رہی اس سے قارئین طلوع اسلام بے خبر نہیں ہونگے۔ لیکن تعجب خیز امر یہ ہے کہ علامہ ممدوح نے جو سوال اٹھایا تھا اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ کئے بغیر جریدہ "لائٹ" نے بھی اس موضوع پر رائے زنی کرنا شروع کردی۔ جہانتک ختم نبوت کا تعلق ہے مدیر "لائٹ" ڈاکٹر صاحب کے ارشادات سے حرف بحرف متفق تھے لیکن کسی نامعلوم اختلال ذہنی کی بنا پر انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ ختم نبوت سے مقصد یہ ہے کہ انسان دینی قیود سے آزاد ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ اس غلط اور بے بنیاد تعبیر کو کوئی صحیح الفہم انسان ایک لمحے کے لئے بھی قبول نہیں کرے گا۔ جریدہ ٹروتھ نے ایڈیٹر صاحب کو اس غلط بیانی پر متنبہ بھی کیا تھا۔ پھر راجہ حسن اختر صاحب نے اپنے ایک مراسلے میں — جس کو ہم کسی دوسری جگہ شائع کر رہے ہیں۔ لائٹ کے شبہات کی تردید کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ "تشکیل جدید" کے پانچویں خطبے میں یہ بحث کسیقدر زیادہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے جس کے مطالعہ کے بعد کسی غلط فہمی کا احتمال نہیں رہے گا۔ لیکن ایڈیٹر لائٹ غالباً فلسفے سے ناواقف ہیں اس لئے کہ ان افسوسناک غلط فہمیوں کے اعتراف کو بجائے جن کی بغیر کسی احساس ذمہ داری کے انھوں نے بڑے جوش و خروش سے اشاعت کی

ہے وہ بدستور اپنی رائے پر قائم ہے اور تشکیل جدید کی عبارات میں کچھ اس قسم کی معنوی تحریفیں کی ہیں جن کو دیکھکر تعجب بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انکے شبہات خلوص اور دیانتداری پر مبنی ہیں لیکن جیساکہ انھوں نے خود کہا ہے انہیں "شاعر کی ذات سے عقیدت اور نیاز مندی کا دعویٰ ہے" اور اس امر کا اعتراف بھی کہ "نوجوانان اسلام کی خوابیدہ روحیں اقبال ہی کی شاعری سے بیدار ہوئیں" لہٰذا انھیں سوچنا چاہئے تھا کہ ان کا ذہن جس غلط نتیجے پر پہنچا ہے اس کی ذمہ داری خود انھیں کے عجز فہم پر عائد ہوتی ہے یا راجہ صاحب کی تصریحات پر یہ اس لئے کہ شاعر کا پیغام تمسک بالکتاب، اتباع رسول صلعم اور پابندی دین کے سوا اور کچھ نہیں۔ بہرکیف ایڈیٹر لائٹ کی ساری دقت تشکیل جدید کی یہ عبارت ہے: "اسلام کا ظہور۔۔۔ استقرائی علم کا ظہور ہے۔۔۔ اسلام نے نبوت کی تکمیل سے خود نبوت کو ختم کر دیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ قیود کا پابند نہیں رکھا جا سکتا۔ شعور ذات کی تکمیل کے لئے ضروری تھا کہ انسان کو اس کی ذاتی قوتوں پر چھوڑ دیا جائے۔" ان سطور سے ہمارے فاضل صحافی نے یہ عجیب و غریب نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "اقبال نے عقل انسانی کو وحی پر ترجیح دی ہے۔ ان کے نزدیک ذات یا انا تمام عظمتوں کا دارومدار ہے۔۔۔ یہ نیٹشے کا اثر ہے۔۔۔ مغربیت کی جھلک۔۔۔ اگر ختم نبوت سے مطلب سلسلہ وحی کا انقطاع اور عقل کا ظہور ہے تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ اب ہماری نجات قرآن سے وابستہ نہیں۔۔۔ اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک شعور نبوت ایک قسم کی کفایت فکر ہے جس کا تعلق انسان کے عہد طفولیت سے تھا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ"۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ایڈیٹر صاحب لائٹ۔ اگر وحی و عقل کے باہمی فرق اور تاریخ انسانی کے مختلف ادوار تمدن سے ناواقف ہیں لہٰذا تشکیل جدید کی عبارتوں کا مطلب نہیں سمجھے تو خیر یہ ان کی معذوری تھی لیکن انھوں نے راجہ صاحب کی فہمائش کے باوجود بعض ضروری عبارات کو نظر انداز کر دیا اور اس طرح تحقیق و تنقید کی دنیا میں ایک شدید ناانصافی کے مرتکب ہوئے۔ تشکیل جدید کی پوری عبارت یہ ہے۔

اسلام کا ظہور جیسا کہ ہم آگے چل کر ظاہر کریں گے۔ استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام نے نبوت کی تکمیل سے خود نبوت کو ختم کر دیا۔ اس میں یہ نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ قیود کا پابند نہیں رکھا جا سکتا شعور ذات کی تکمیل کیلئے ضروری تھا کہ انسان کو اس کی ذاتی قوتوں پر چھوڑ دیا جائے۔ اسلام نے دینی پیشوائی اور بادشاہت کو بھی تسلیم نہیں کیا۔ علیٰ ہذا قرآن مجید نے انسان کے محسوسات و مدرکات اور غور و فکر پر بار بار زور دیا ہے اور کہا ہے کہ تاریخ اور فطرت دونوں علم کے ذرائع ہیں۔ یہ سب اس خیال کے مختلف پہلو ہیں جو انقطاع نبوت کی تہ میں کام کرتا ہے۔ لیکن یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ باطنی واردات ۔۔ الہام و کشف ہیں (مدیر) کو جو باعتبار کیفیت شعور نبوت سے مختلف نہیں اب زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا قرآن مجید نے انفس اور آفاق دونوں کو علم کا ماخذ ٹھیرایا ہے۔ آیات الہیہ کا ظہور (داخلی، محسوسات اور (خارجی) مدرکات دونوں میں ہوتا ہے اور انسان کا فرض ہے کہ اپنی واردات کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتا رہے اور اس طرح معلوم کرے کہ ان میں کہاں تک حصول علم کی صلاحیت موجود ہے۔ لہذا ختم نبوت کا یہ مطلب نہیں کہ اب زندگی پر عقل کی حکمرانی مقدر ہو چکی ہے' اس میں جذبات کو دخل نہیں ہوگا۔ ایسا ہونا نہ ممکن ہے نہ مقصود۔ عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے باطنی واردات کے متعلق ایک آزادانہ اور ناقدانہ طرز عمل قائم کرنے میں مدد ملتی ہے کیونکہ اس سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ اب نوع انسانی کی تاریخ میں کوئی شخص اس بات کا دعویٰ نہیں کرے گا کہ وہ کسی مافوق الفطرت اختیار کی بنا پر ہمیں اپنی اطاعت کیلئے مجبور کر سکتا ہے پس ختم نبوت کا مقصد یہ ہے کہ ہماری داخلی واردات کی دنیا میں بھی نئے نئے مظاہر علم کا انکشاف ہو بعینہٖ جس طرح کلمۂ توحید کے جزو اول (لا الہ الا اللہ) نے انسان کے اندر یہ روح پیدا کی ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کا مطالعہ نگاہ تنقید سے کرے اس لئے کہ مظاہر فطرت کو الوہیت سے کوئی تعلق نہیں جیسا کہ اسلام سے پہلے کی تہذیبوں کا خیال تھا . . ."

اس عبارت کی موجودگی میں اگرچہ کسی ایسی غلط فہمی کا امکان نہیں جس میں ایڈیٹر صاحب لائٹ گرفتار ہیں کیونکہ سطور بالا میں نہایت کھلے الفاظ میں بتلا دیا گیا ہے کہ ۱۔ مکالمۂ الٰہیہ یعنی الہام وکشف کا سلسلہ جاری ہے۔ ۲۔ یہ ناممکن ہے کہ زندگی پر صرف عقل کی حکمرانی ہو۔ ۳۔ پیغمبر اسلام صلعم پر نبوت کی تکمیل ہوئی۔ ۴۔ اب کوئی شخص کسی مافوق الفطرت دعویٰ کی بنا پر ہمیں اپنی اطاعت کے لئے مجبور نہیں کرسکتا اور عقلی اعتبار سے اس عقیدے کی اہمیت یہ ہے کہ (ا) اس نے انسان کو خدا تعالےٰ کی آخری وحی کے بعد کسی دوسری وحی کا پابند نہیں کیا (ب) اسے خارجی اور داخلی دونوں ذرائع علم کی تنقید وتفتیش پر آمادہ کیا اور اس طرح (ج) شعور ذات کی تکمیل میں اسے اپنی قوتوں پر بھروسہ کرنا سکھلایا۔ یہ نبوت محمدیہ کا احسان ہے کہ تکمیل دین اور اتمام نعمت کے بعد اب ہمیں قرآن مجید کے علاوہ کسی دوسری وحی کی ضرورت ہے نہ سلسلہ انبیاء کی۔

تشکیل جدید کے اس اقتباس سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ اڈیٹر لائٹ کا ذہن کن مغالطوں میں الجھ گیا ہے ایک تو یہ کہ وہ عقل اور وحی کے باہمی فرق کو نہیں سمجھتے۔ ثانیاً انہیں تمدن انسانی کے ارتقا کا ٹھیک اندازہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شعور ذات استقرائی علم اور ذاتی قوتوں میں سے کسی کا مطلب نہیں سمجھے ورنہ ان کی نظر سے علامہ اقبال کا یہ ارشاد گذر چکا ہے کہ باعتبار اس روح کے جس کا اظہار وحی محمدیہ سے ہوتا ہے رسالتمآب صلعم کا تعلق دنیائے جدید سے ہے گویا دنیائے جدید کبھی وحی محمدی یعنی اسلام۔ قرآن وسنت ۔۔ سے آزاد نہیں ہوسکتی۔ اور وحی محمدی کا کامل اتباع صرف اس طرح ممکن ہے کہ آئندہ ہم کسی شخص کے اقوال واعمال کو خواہ وہ ظلی اور بروزی نبی ہو یا مجدد یا مصلح امت اپنے لئے حجت نہ ٹھہرائیں اس لئے کہ اس قسم کے اصطلاحی "انبیاءؑ اور موعود مجددین" اگرچہ لفظاً تو یہی کہتے ہیں کہ انھیں قرآن وسنت کی پیروی مقصود ہے لیکن ان کے الفاظ کی روح یہ ہوتی ہے ۔۔ اور اسے لازماً تسلیم کرنا پڑے گا۔۔۔ کہ امت کے لئے انکے قول وفعل کی پابندی

شرط ہے یہی وہ "قیود" ہیں۔ جن کو رسالت محمدیہ کی ابدیت نے ہمیشہ کے لئے توڑ ڈالا ہے۔
کیا ایڈیٹر صاحب لائٹ انکار کر سکتے ہیں۔ کہ یہ انسان کے شعور ذات کی تکمیل میں ایک ضروری مرحلہ تھا جس کی اہمیت کا شاید وہ اپنے مخصوص عقائد کی وجہ سے ٹھیک اندازہ نہیں کر سکے۔

بہرکیف ختم نبوت کا مسئلہ اس قدر اہم ہے اور اس کے متعلق علامہ اقبال نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اگر ان کی مزید تشریح کردی جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ یوں بھی ایک علمی اور دینی بحث کی حیثیت سے اس بارے میں کسی مزید غلط فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہنی چاہیے۔
یاد رکھنا چاہیے کہ تشکیل جدید کی جس عبارت سے ایڈیٹر لائٹ نے ٹھوکریں کھائی ہیں ان کا موضوع عقلی اعتبار سے ختم نبوت کی تائید کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ آنحضرت صلعم کے بعد بعثت انبیا کا سلسلہ بند ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے امور ذیل کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

اول یہ کہ عقل اور وحی دونوں کو علم کا ماخذ ٹھہرا کر ان کا باہم مقابلہ کرنا صحیح نہیں اس لئے کہ علم کا ذریعہ انسان کے داخلی اور خارجی حواس ہیں۔ عقل انکشافات حواس کی تنقید کرتی ہے خواہ وہ ظاہری ہوں یا معنوی۔ جس طرح ریاضیات و ہیئت اور دوسرے علوم فطرت کی دنیا میں ہمیں اپنے خارجی حواس کی بدولت جو علم حاصل ہوتا ہے عقل نے اس کی صحت و عدم صحت کا جائزہ لیتے ہوئے مختلف نظریوں اور اصول و کلیات کی بنا رکھی اور انسان کو اس کے بعض مغالطوں پر مطلع کیا۔ مثلاً طلوع و غروب آفتاب یا سکون زمین ـــــ اسیطرح تکمیل وحی کے بعد عقل کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہر مدعی الہام و کشف کی نفسیاتی حالت کی تنقید کرے تاکہ اس امر کا پتہ چل سکے کہ جو شخص الہام و کشف کا دعویٰ کرتا ہے اُس کی شخصیت کیا ہے۔
یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ملت اسلامیہ میں اس تنقید کا مدار قرآن و سنت پر ہوگا۔

دوسرے یہ کہ وحی بلاشبہ حصول علم کا ایک ذریعہ ہے لیکن اس میں اور علم بالحواس میں فرق یہ ہے کہ جہاں علم بالحواس محنت اور انتظار کا پابند ہے اور اس کے لئے قید زمانی شرط وہاں وحی میں علم کا یہ زمانی عنصر غائب ہو جاتا ہے۔ گویا یہ ایک لمحے یا "طرفۃ العین" میں ان حقائق کا انکشاف

ہے جن کو ہم اپنے حواس کی مدد سے غالباً ہزارہا سال کی مدت میں بھی معلوم نہیں کر سکتے۔ باعتبار کیفیت اگر ہم علم بالوحی کا تصور کرنا چاہیں تو اس کے لئے الہام وکشف یا آرٹ اور فلسفہ وحکمت کی دنیا میں "القا" کی مثال پیش کی جاسکتی ہے لیکن جس طرح بلحاظ قدروقیمت الہام وکشف کا درجہ "القا" سے بلند ہے اسیطرح کشف والہام کو وحی سے کوئی نسبت نہیں کیونکہ کشف والہام کی کیفیت انفرادی ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے لئے حجت نہیں۔ برعکس اس کے وحی ایک اٹل اور ناقابل انکار حقیقت ہے اور اس سے جن حقائق کا انکشاف ہوتا ہے ان کی پابندی ہر شخص پر فرض ہے۔ لہذا اصطلاحاً وحی کا لفظ اسیوقت استعمال کیا جاتا ہے جب خود اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو ہمکلامی کے لئے منتخب کرے اور اس طرح اس سے انسان کی ہدایت و رہنمائی کا مقصد پورا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ نبی کی حیثیت ہمیشہ اجتماعی ہوتی ہے اور اس کا وجود ہمارے لئے حجت ضروری نہیں کہ ہم عقلاً اس کی تمام مصلحتوں کو سمجھ سکیں۔

تیسرے یہ کہ اسلام سے پہلے جو ادوار تمدن گذرے ہیں ان میں باوجود اختلافات کے ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ ان سب کی بنا استخراج پر تھی جو استقرا کے برعکس تحقیق حق اور تسخیر فطرت کا ایک سہل مگر ناقص طریق ہے اس لئے کہ یہ وہ منہاج علم ہے جو تجربہ ومشاہدہ اور محنت واستقرار کی سعی وجہد سے آزاد ہے۔ اسی لئے وحی الہی کی ضرورت تھی کہ بار بار انسان کو اس کی غلطیوں پر متنبہ کرے۔ لہذا اس کے رشد وہدایت کے لئے ہر جگہ اور ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے رہے جن کی تبعیت وپیروی فرض تھی۔ یہ گویا تاریخ انسانی کا عہد طفولیت ہے جس میں انسان اپنی ترقی کے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا۔ وحی الہی نے بتدریج اس کی تربیت کی۔ اگر یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تو ناممکن تھا کہ انسان کے اندر اعتماد علی النفس پیدا ہوتا اور وہ اپنے شعور ذات کی من کل الوجوہ تکمیل کر سکتا کیونکہ اس کے لئے کوئی نظام حیات آخری اور قطعی نہیں تھا۔ تکمیل وحی کی ضرورت خود اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے قبل انسانیت کی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس سے ان برگزیدہ اور مقدس افراد کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا جو منصب نبوت سے

سرفراز ہوئے۔ اس لئے کہ یہاں بحث نوع انسانی سے ہے — اس کے تدریجی ارتقا سے — کہ حکمت الٰہیہ کس طرح اس کو اس مرحلے پر لے آئی جب اسے علم استقرائی سے روشناس کرانا مقصود تھا (علم استقرائی کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ انسان اپنے ماحول پر غالب آسکے) اور رسالت محمدیہ کے ذریعے زندگی کی آخری اور دوامی اساس اس پر منکشف کی۔ اس امر کو قرآن پاک نے کس خوبی سے تکمیل دین اور اتمام نعمت سے تعبیر کیا ہے اور حقیقت میں نبی آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہم انسانوں پر اتنا بڑا احسان ہے جس کا حق قیامت تک بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ البتہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس آخری ہدایت کے ہوتے ہوئے بھی انسان چھوٹی چھوٹی اور وقتی ہدایتوں کا محتاج ہے یا یہ کہ وحی محمدی کے باوجود قانون حیات کی تکمیل ابھی باقی ہے — یعنی وہ لوگ جو ضرورت نبوت کے قائل ہیں تشریعی ہو یا غیر تشریعی اور وہ لوگ جو مغربی خیالات کے زیر اثر نظام شریعت کو اپنے لئے حجت نہیں سمجھتے — وہ دانستہ یا نادانستہ نبوت محمدیہ کے منکر ہیں۔ اس لئے کہ وہ انسان کو پھر اس دور کی طرف لے جانا چاہتے ہیں جہاں سے اسلام ان کو آگے لے آیا تھا۔ بالفاظ دیگر وہ تکمیل دین اور اتمام نعمت کا مطلب نہیں سمجھتے اور انہیں تعلیمات قرآنی میں کوئی بصیرت حاصل نہیں۔

چوتھے یہ کہ اختتام وحی یا انقطاع نبوت سے یہ استدلال کرنا غلط ہے کہ اب عقل کو (نعوذ باللہ) وحی پر ترجیح حاصل ہے۔ لہٰذا اس سے مقصود تبعیت وحی کو ختم کر دینا ہے — یہ کہنا کہ آئندہ کے لئے نزول وحی کو روک دیا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ کہاں مترتب ہوتا ہے کہ اب وحی کی پیروی ضروری نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں قضایا باہم اس درجہ مختلف ہیں کہ ان کو دنیا کی کوئی منطق ایک نہیں ٹھہرا سکتی — اس لئے کہ ہمیں اپنی زندگی کے متعلق جو بصیرت حاصل ہوئی ہے اس کا سرچشمہ بھی وحی ہے — یہ وحی الٰہی ہے جس کی بدولت انسان نے اپنے موجودہ دور ارتقا میں قدم رکھا۔ لہٰذا ان میں سے ایک کا انکار گویا دوسرے کا انکار ہوگا۔ یہ کیونکر ثابت ہوا کہ نبوت محمدیہ نے ہمارے لئے جو راہ مقرر کی ہے اس کا اختیار کرنا احکام نبوت کو رد کرنا ہے۔ اس سے تو خود بخود احکام نبوت کا اتباع لازم آتا ہے۔ اگر اسلام نے انسان کو علوم استقرائی سے روشناس کرایا اور اس کو بار بار

عقل و فکر اور مشاہدے کی دعوت دی تو عقل و فکر اور مشاہدے کے ساتھ استقرائی علوم کا وجود کس دلیل کے ماتحت اسلام کا منافی ہے؟ اس سے اگر کوئی نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ اگر شعور ذات کی تکمیل کے لئے ضروری تھا کہ انسان کو اس کی ذاتی قوتوں پر چھوڑ دیا جائے تو یہ اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ انسان محمد رسول اللہ صلعم کی غلامی اختیار نہ کرے لہذا نبوت محمدیہ کی ختمیت ہی اس کی ابدیت پر دلالت کرتی ہے بلکہ اگر ہم چاہیں بھی تو احکام نبوت سے آزاد نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ احکام زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہوئے ہیں جنکو فطرت صحیحہ خود بخود قبول کرتی ہے۔ ان کا اتباع گویا تقاضائے فطرت کا اتباع ہے اسی لئے اسلام کو دین فطرت کہا گیا ہے اور اللہ تعالےٰ نے اسے خود ہمارے فائدے کے لئے پسند کیا۔ یہ مقصود نہیں تھا کہ وہ ہمارے لئے تکلیف کا باعث ہو۔ ما جعل علیکم فی الدین من حرج۔

پانچویں یہ کہ نبوت کے دو پہلو ہیں۔ ایک وہ مخصوص حالات و واردات جن کو مد نظر رکھتے ہوئے اسلامی تصوف میں نبوت کو روحانیت کا ایک مقام خاص ــــ مقام بھی تصوف کی ایک اصطلاح ہے ــــ تصور کیا جاتا ہے، اور دوسرا سنت نبوی جس سے ایک جدید اجتماعی اور سیاسی فضا کی تخلیق ہوتی ہے اور انبیاء و مرسلین جماعت انسانی کے سامنے اخلاق و اعمال کا ایک نیا تخیل پیش کرتے ہیں جس کے اقرار سے انسان کمالات زندگی تک پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اس جدید نظام میں شریک نہیں ہوتا وہ کمالات ذات سے محروم رہتا ہے۔ اس محرومی کو مذہبی اصطلاح میں لفظ کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا رسالت کی تصدیق محض صاحب رسالت کے مرتبہ و مقام کا اعتراف نہیں بلکہ یہ عبارت ہے اس کی سنت کے اتباع اور جس اخلاقی فضا کی تخلیق اس کے وجود سے ہوئی تھی اس میں پرورش حاصل کرنے سے اگر کوئی شخص اس پابندی سے گریز کرتا ہے تو وہ بلا شک و شبہ کافر ہے۔ لہذا نبوت کا اطلاق اسیوقت ہو سکتا ہے جب کسی شخص میں دونوں اجزا موجود ہوں بالفاظ دیگر ختم نبوت کے یہ معنی ہونگے کہ جناب رسالتمآب صلعم کے بعد اب کوئی شخص اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ ان اجزا کا حامل ہے یعنی ایک طرف

اسے روحانیت کا وہ مقام حاصل ہے جو انبیائ کے لئے مخصوص تھا اور دوسری جانب اس کی ذات ملت کیلئے حجت کہ اگر ہم اس کی جماعت میں داخل نہیں ہوتے تو گویا کفر کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جو شخص اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے وہ کاذب ہے اور شریعت اسلامی کی رو سے واجب القتل جیسا کہ مسیلمہ کذاب کی مثال سے صاف ظاہر ہے کہ اسے باوجود رسالت محمدیہ کی تصدیق کے قتل کر دیا گیا۔ البتہ ختم نبوت کا یہ مطلب نہیں کہ مکالمۂ الٰہیہ۔ کشف و الہام کا سلسلہ۔ منقطع ہو گیا ہے کیونکہ ہر سچے اور اخلاص مند مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلام کو بطور دین فطرت کے اپنی ذات پر منکشف کرے یہ گویا اس کے بینکر وہ حقائق سے اتحاد اتصال کی کوشش ہے جس کو اصطلاحًا لفظ "تصوف" سے تعبیر کیا گیا ہے مگر اس طرح انسان کو جو مقام حاصل ہوتا ہے اس کو ولایت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ نبی آخرالزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد الہام و کشف کی حیثیت محض ثانوی ہے وہ کسی شخص کے ذاتی واردات اور مشاہدات تو ضرور ہیں لیکن ان کی جماعتی حیثیت کچھ بھی نہیں ۔۔۔ امت کو ان کی تنقید و تحقیق ۔ علیٰ ہذا تنقیص ۔ کا حق حاصل ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ صاحب الہام ان کو اپنے لئے حجت سمجھے مگر یہ کہنا کہ وہ تمام عالم اسلام کے لئے بھی حجت ہو سکتے ہیں۔ غلط ہو گا کیونکہ اس طرح استقرا و تنقید اور روایت و درایت غرضیکہ تاریخ اور علم و حکمت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہی فتنہ تھا جس سے امت کو محفوظ رکھنے کے لئے ختم نبوت کی ضرورت پیش آئی تاکہ وحی محمدی کو قیامت تک حجت ٹھیرایا جا سکے۔ گویا ختم نبوت سے مقصد مطلقًا باب نبوت بند کر دینا ہے یعنی یہ کہ اب انسان کی تاریخ میں کسی جدید اخلاقی اور اجتماعی فضا کی تخلیق نہیں ہو گی اس کو جس چیز کی ضرورت تھی مل گئی۔ انسان اس بات کا محتاج نہیں کہ وہ اپنی ہدایت و رہنمائی کیلئے نئے نئے انبیا کی آمد کا منتظر رہے۔ اس کی تکمیل ذات اور اعتماد علی النفس کے تمام مراحل پورے ہو چکے ہیں خدا کا بھیجا ہوا قانون اور اس کا عملی نمونہ یعنی سنت نبوی اس کے سامنے ہیں۔ یہ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی سعی و کوشش سے اس راہ پر چلے اور اس طرح فیوض و برکات الٰہیہ کا مستحق ہو۔ لیکن یہ امر کہ ملت اسلامیہ کیلئے جناب رسول مقبول صلعم کے علاوہ کسی دوسرے انسان کا اتباع اور

پیروی ضروری ہے صحیح نہیں۔ اس کا یہ مطلب ہو گا کہ نبوت محمدیہ کے باوجود ابھی انسان کو مزید ہدایات اور رہنمائیوں کی ضرورت ہے حالانکہ کتاب و سنت کے ہوتے ہوئے ایمان و یقین کی تکمیل ہو چکی ہے اور اب انسان اپنی نجات کے لئے کسی دوسرے انسان کا محتاج و منتظر نہیں۔ تاریخ انسانی کے ایک دور میں البتہ اس کی ضرورت تھی لیکن ظہور اسلام کے ساتھ اس دور کا جس کے نفسیاتی خصائص میں انتظار اور بے اعتمادی شامل ہیں —— لہذا اس کے لئے "مجوسی ثقافت" کی اصطلاح وضع کی گئی ہے —— خاتمہ ہو گیا کیونکہ تکمیل دین کے بعد اس امر کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ انسان کو اور وحیوں اور ہدایتوں کا منتظر رکھا جائے یہی وجہ ہے کہ اب اسلام میں تشریعی اور غیر تشریعی نبوت، ظل و بروز بعثت " مجددین و مامورین " اور ظہور آئمہ کے جو تصورات قائم ہیں وہ سب مجوسی انداز خیال کا نتیجہ ہیں اور ختم نبوت میں خارج ہوتے ہیں۔ اسلام کو ان سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ جن احادیث و روایات کو انکی تائید میں پیش کیا جاتا ہے ان کے باوجود تمام ائمہ، صوفیا اور سلف صالحین نے اس قسم کے کسی عقیدے کو صحیح تسلیم نہیں کیا۔ گویا مجوسی ثقافت کے حامی ان کی جو تاویل کرتے ہیں غلط ہے شرعی لحاظ سے دیکھا جائے تو قرآن و سنت سے ان کی کوئی سند نہیں ملتی اور عقلی اعتبار سے وہ اعتماد و ذات اور تکمیل شعور کی اس دولت کو چھین لیتے ہیں جو بنی نوع انسان پر اسلام کا ایک زبردست اور ناقابل انکار احسان ہے۔

اس وقت مسلمانوں میں دو قسم کی طبائع ہیں جو دانستہ یا نادانستہ رسالت محمدیہ کی منکر یا کم از کم اس کی صحیح قدر قیمت کا اندازہ کرنے سے قاصر ہیں ایک تو وہ جماعت ہے جو "مجوسی ذہنیت" کے زیر اثر قرآن و حدیث اور ائمہ و صوفیا کے اقوال میں عجیب و غریب معنوی تحریفات سے ظل و بروز، افاضۂ محمدیہ اور مجددیت و محدثیت کے بہانے تسلسل نبوت کو قائم رکھنا چاہتی ہے اور اسلامی تعلیمات کے مقصود و منتہا کے علاوہ تاریخ، تمدن اور فلسفہ و حکمت کا بھی کوئی واضح تصور نہیں رکھتی دوسرے وہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال نوجوان ہیں جنھوں نے مغربی جوامع میں بیٹھکر اپنے سرمایہ تحقیقات سے مختلف مضامین پر تھیسس (Thesis) لکھے ہیں اور اب سرکاری اور غیر سرکاری،

آزاد اور قومی درسگاہوں میں نادان طالبعلموں کو الحاد و بیدینی کا سبق دیا کرتے ہیں ان کا مبلغ علم یہ ہے کہ وہ اسلام اور شریعت اسلامی سے ناواقف اور اس کی تاریخ و تمدن سے بے خبر، نظریات، و "سفر و ضات" کی دنیا میں تکمیل انسانیت کا خواب دیکھتے ہیں۔ ان کے اندر یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ بعثت محمدیہ کی روشنی میں مقاصد انسانی کا تصور کر سکیں۔ یہ منفیانہ مسلمان، اس لئے کہ ان کو بجز سہولت تعارف کے عملاً اسلام سے کوئی ہمدردی نہیں کبھی نیشنلسٹ بنتے ہیں اور کبھی سوشلسٹ — اور معلوم نہیں کیا کیا کچھ۔ مسلمان بنتے ہوئے ان کو بہرکیف وحشت ہوتی ہے۔ بایں ہمہ ان کو مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و رہنمائی کا دعویٰ ہے! اللہ تعالیٰ ملت اسلامیہ کو ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ رکھے — آمین۔

سید نذیر نیازی

۲۔ سر شاہ سلیمان کا نظریہ اضافیت

جب سے آئین اشٹائین نے مکان و زمان کے متعلق اپنے خیالات پیش کئے ہیں علم حکمت کی دنیا میں ایک انقلاب رونما ہے۔ اہل نظر خوب جانتے ہیں کہ نظریۂ اضافیت نے کس طرح طبیعات حاضرہ کی اساس ہی کو بدل ڈالا ہے۔ آئین اشٹائین کی حیثیت اور اس کی غیر معمولی عظمت اس وقت مسلم ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ جدید سائنس کا رخ اب بڑی تیزی کے ساتھ اسی کے قائم کردہ نظریات کی طرف ہے۔ لیکن علم و حکمت کی ساری خوبی اس کی عدم قطعیت اور آزادانہ تنقید میں ہے۔ بایں ہمہ نظریۂ اضافیت پر رائے زنی کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ اس کے لئے طبیعات و ریاضیات میں غیر معمولی تبحر اور دقت نظر کی ضرورت ہے لہذا اس ضمن میں کوئی دوسرا نظریہ پیش کرنا یقیناً ایک حیرت انگیز بات ہوگی۔ لیکن سر شاہ سلیمان چیف جج عدالت عالیہ الہ آباد نے جن کی ذات تمام ہندوستان کے لئے موجب فخر ہے اپنی مصروفیتوں کے باوجود ایک جدید نظریہ قائم کیا ہے جس کا چرچا کچھ دنوں سے ہندوستان کے علاوہ مغرب کے علمی رسائل میں ہو رہا ہے۔ سر موصوف آئین اشٹائین کی نسبت یہ ...

کے طرفدار ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ نیوٹن ہی کی طبعیات میں تھوڑی سی تبدیلیاں کر دیجائیں تو بہت سے ایسے حقائق کی تشریح ہو جائے گی جن کی بنا پر نظریہ اضافیت پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے قائم کردہ نتائج کو "جدید نظریۂ اضافیت" کے نام سے پیش کیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا "نیوٹنی میکانیات کی صحت میں فرق ہے۔ اس لئے کہ بعض فلکی مشاہدات اس سے مختلف ثابت ہوتے ہیں۔ آئین اشٹائین کے مفروضات اگرچہ غیر معمولی اور ناقابل یقین ہیں۔ بایں ہمہ ان سے عملاً بہتر نتائج مرتب ہوئے ہیں۔ لہٰذا کسی دوسرے نظریہ کی عدم موجودگی میں ان کو صحیح تسلیم کر لینا چاہئے"

شاہ صاحب موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ "ایک زمانے میں خیال تھا کہ تین مظاہر ایسے ہیں جن سے آئین اشٹائین کی عمومی اضافیت کی تصدیق ہوتی ہے لیکن اب اس امر کا پتہ چل گیا ہے کہ ان کی باہمی مطابقت مکمل نہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اگر نیوٹن کی میکانیات میں یہ ترمیم کر دی جائے کہ کشش ثقل کی رفتار غیر متناہی نہیں جیسا کہ نیوٹن کا خیال تھا بلکہ متناہی رہتی ہے تو وہ تینوں نتائج جن کے استخراج کا دعویٰ اضافیت کو ہے بآسانی نیوٹن کے اصول و کلیات سے بھی اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ بلکہ ہم اپنے تخمینوں میں جس قدر آگے بڑھینگے اتنے ہی بہتر نتائج مرتب ہونگے۔

چنانچہ سر سلیمان نے ان نتائج کی قدروں کے متعلق زیادہ صحت کے ساتھ خبر دی ہے جس کا امتحان ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں کسوف کے موقع پر ہو سکے گا۔ لیکن وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس امر کی آخری اور قطعی آزمائش یہ ہے کہ دور دور کے ستاروں سے جو روشنی آتی ہے اُس پر کشش آفتاب کا اثر کیا ہے کیونکہ نور کی رفتار نہایت تیز ہے اور اگر اس میں نیوٹن کے اصول سے ذرا بھی انحراف ہوا تو اس کا فرق بہت نمایاں ہوگا۔ سر موصوف نے جو نتائج قائم کئے ہیں۔ وہ ان قدروں سے جن کا مشاہدہ فی زمانہ کیا گیا ہے آئین اشٹائین کی نسبت کہیں زیادہ صحیح ہیں۔ لہٰذا سر سلیمان نے ایک نہایت درجہ مفصل ریاضیاتی نظریہ ہی قائم نہیں کیا جس کے ماتحت ہم ان مظاہر کی تشریح کر سکتے ہیں جو بالعموم اضافیت کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں بلکہ انھوں نے چند قابل عمل اصول بھی پیش کئے اور ایسے نتائج کی خبر

دی ہے جن کا فلکیین فی الواقعہ مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں اس بزم (Symposium) کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا جسے سائنس اکیڈیمی صوبجات متحدہ نے ترتیب دیا تھا۔ اس موقعہ پر سرشاہ سلیمان نے اپنے نظریات کی مزید وضاحت کی۔ انھوں نے حاضرین بزم کو بتلایا کہ ان کا رضیاتی نظریہ ان کے طبعی نظریہ سے بالکل الگ ہے جس کے لئے وہ کشش کا وجود ضروری نہیں سمجھتے البتہ اس ضمن میں ان کا نیا مفروضہ صرف رفتار کشش کی متناہیت کا ہے۔ اس موقعہ پر جو امور تشریح طلب تھے ان کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مسٹر ڈی۔ آر۔ ہملٹن نے مجلہ سائنس میں ان کے نظریے پر تنقید کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان کا طبیعی نظریہ لاپلاس سے ماخوذ ہے لیکن یہ ہملٹن کی غلط فہمی ہے کیونکہ ان دونوں نظریات کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ انھوں نے بعد ابعد اور مریخ، زہرہ اور زمین کے متعلق بعض ایسے مظاہر کی شہادت پیش کی جنکو ہملٹن نے بھی صحیح تسلیم کیا ہے۔ پروفیسر اے۔ سی۔ بنرجی کے ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے جو انھوں نے اکیڈیمی کی گذشتہ روداد میں ظاہر کئے ہیں۔ شاہ صاحب موصوف نے فرمایا کہ انھوں نے صرف ایک مفروضہ قائم کیا ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ بہت سے بے جوڑ مفروضات سے کام لے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے نیوٹن کی حمایت کرتے ہوئے بعض ایسی تصحیحات کی طرف اشارا کیا جو نیوٹنی میکانیات کے لئے ناگزیر ہیں۔ ان کی رائے میں گو نیوٹن کی مطلق رفتاروں کی پیمائش واقعتہً ممکن نہیں لیکن فلسفیانہ اعتبار سے ان کا تصور کیا جاسکتا ہے اور ریاضائی لحاظ سے قابل عمل۔ بایں ہمہ سرسلیمان کے نظریوں کے متعلق اہل فن کا یہ خیال ہے کہ ان میں آئین اسٹائین کے نظریہ اضافیت کی نسبت کہیں زیادہ اشکال اور پیچیدگیاں موجود ہیں۔ کہا گیا ہے کہ جب تک سرموصوف کے نظریوں کی یہ پیچیدگی دور نہ ہوجائے یا ان کی صحت کا کوئی واقعی ثبوت نہ مل جائے آئین اسٹائین کے نظریات کا برقرار رکھنا ضروری ہے۔ ان پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ انھوں نے آئین اسٹائین اور نیوٹن کے نظریوں کو ایک عجیب وغریب طور پر ملا دیا ہے۔ علیٰ ہذا اگر آئین اسٹائین کے نظریہ

اضافیت کو ترک کر دیا جائے تو اس سے طبعیات کو جو مدد ملی ہے اس کی تلافی بھی "جدید نظریۂ اضافیت" کے لئے ضروری ہوگی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سر شاہ سلیمان کی ذمہ داریاں بہت وسیع ہیں کسی جدید علمی نظریے کی قبولیت سے پہلے یہ بہت ضروری ہے کہ سائنس کے جس شعبے سے اس کو تعلق ہے وہ اس کی جملہ ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس ضمن میں سر موصوف کو ابھی بہت سی تنقیدات کا جواب دینا ہوگا اور غالبًا انھیں اپنے خیالات پر مکرر سہ کرر غور کرنا پڑے لیکن یہ علم و حکمت کی دنیا میں ایک نہایت ہی اہم اور خوشگوار مرحلہ ہے جس سے تمام اہل علم کو گذرنا پڑتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ طلوع اسلام کی کسی آئندہ اشاعت میں ہم اس موضوع پر کسیقدر تفصیل کے ساتھ بحث کر سکینگے۔ انشاء اللہ

ملخصاً